تحریک ریشمی رومال

مصنف: مولٰنا حسین احمد مدنی
مرتبہ: مولوی عبدالرحمٰن،

تحریک ریشمی رومال'

مولانا حسین احمد مدنیؒ

مرتبہ:۔ مولانا عبدالرحمانؒ

تحریک
ریشمی رومالؒ

کلاسیک ○ لاہور

ناشر: آغا امیر حسین
کلاسیک: ناشر و تاجر- لاہور
طابع: چودھری علی محمد،
اُردو پریس- میکلوڈ روڈ- لاہور
پہلی بار: ۱۰۰۰ سنہ ۱۹۶۰ء

الجزائر کے حریت پسندوں کے نام

پیش لفظ

وقت آگیا ہے کہ پاکستان کی تاریخ نئے سرے سے مرتب کی جائے۔ اور پرانے آقاؤں کی مصلحت کوشی کے سبب واقعات کی جو غلط تعبیر ہماری تاریخ کے ساتھ چسپاں کر دی گئی ہے اسے یکسر قلمزد کر کے واقعات کی صحیح تصویر پیش کی جائے۔

۱۸۵۷ء کی تحریک کے متعلق اب سب جان چکے ہیں کہ وہ کوئی غدر نہ تھا، بلکہ آزادی کی تڑپ کا اولین مگر ناکام اظہار تھا۔ اس مشہور تحریک کے بعد بھی کئی ایسی گمنام اور غیر معروف تحریکوں نے بار بار جنم لیا ہے جو اب تک تہ در تہ پردوں میں مستور ہیں۔ ان تحریکوں میں سے ایک "ریشمی رومال" کی تحریک کے نام سے مشہور ہے جو حریت پسندوں نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے کے لئے ۱۹۱۴ء میں چلائی تھی۔ اس کتاب میں اسی ہمہ گیر تحریک پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

یہ کتاب مولانا حسین احمد مدنی کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور اب
مولانا عبدالرحمٰن نے اسے نئے انداز میں مرتب کیا ہے۔

(ناشر)

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ۔ اما بعد

تحریکِ آزادی نمبر ۱

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ سرزمینِ پاک و ہند میں انیسویں صدی سے پہلے جتنی سیاسی تحریکیں چلیں اُن کا مقصد اصلاحِ حکومت تھا۔ کیونکہ اس وقت تک حکومت خود مسلمانوں کی تھی۔ لیکن انیسویں صدی کی ابتدا سے سرزمینِ ہند و پاک کی سیاسی نوعیت بدل گئی تھی۔ ۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک کے اکثر و بیشتر حصوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ مدراس، بنگال، میسور، دکن، بمبئی، روہیل کھنڈ اور یو۔ پی کے صوبجات پر کمپنی کی بلا شرکتِ غیرے حکومت قائم ہو چکی تھی۔ کمپنی کے نمائندوں نے مرکزی حکومت سے ملکی انتظامات کا پروانہ جابرانہ طریق پر لکھوا کر یہ اعلان کروا دیا کہ (خلق خدا کی ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا) اس لئے حکومتِ دہلی اور اسی طرح صوبہ سندھ کی حکومت تو کمپنی کے سامنے لاچار و بے بس ہو چکی تھیں۔ باقی صوبہ سرحد، کشمیر اور پنجاب میں

رنجیت سنگھ کی حکومت تھی جو کمپنی کی معاون و مددگار تھی اور ان کے کمپنی کے ساتھ زوردار معاہدے تھے۔ اندریں حالات خاندان ولی اللّٰہی کے چشم و چراغ اور تیرھویں صدی ہجری کے مجدد اعظم شمس العلماء خاتم المحدثین حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز اور ان کے تلامذہ مریدین اور رفقاء کار کی جماعت نے ملکی اور بین الاقوامی حالات پر غور و خوض کرنے کے بعد آزادیٔ وطن کی سب سے پہلی تحریک کی ابتدا کی۔ اس کا نقشہ اس طرح تیار کیا گیا کہ ہندوستان میں رہ کر مقابلہ کرنا ناممکن تھا، لہٰذا محاذِ جنگ شمال مغربی صوبہ سرحد کو بنایا گیا۔ اور اندرونِ ہند سے مالی اور فوجی سلسلے کی ترسیل براستہ سندھ، کوئٹہ بلوچستان متعین کی گئی۔ اور کوہستانی و دورانی قبائل اور حکومتِ افغانستان سے مالی اور فوجی امداد طلب کی گئی۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے صرف ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔ اور اپنے رفقاء کو ملک کے مختلف اطراف و اکناف میں تبلیغ جہاد پر مامور کیا ہی تھا کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔ پھر آپ کے جانشین، آپ کے تلمیذ و خلیفہ سید احمد شہید مقرر ہوئے اور انھوں نے اس تحریک کو بہ احسن وجوہ صوبہ سرحد میں چھ سال چلایا۔ آپ کا مقصد یہی تھا کہ سکھوں کی حکومت کا زور اراستے سے ہٹا کر پورے ہندوستان سے ظالم حکومت کو نکال کر ملک کو آزاد کیا جائے لیکن ہماری شومیٔ قسمت اور مسلمانوں کی غداری اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی مکاری سے ۱۸۳۱ء میں بمقام بالاکوٹ یہ تحریک شیر سنگھ کے ہاتھوں سے اپنے عروج کے بعد ختم ہو گئی۔ سید احمد شہیدؒ امیر جماعت اور ان کے دست راست اور وزیر و مشیر مولانا محمد اسمٰعیلؒ اور

دوسرے رفقار کار نے جہادِ حریت لڑکر آزادیٔ وطن کے لئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ یہ آزادیٔ وطن کے لئے سب سے پہلی تحریک تھی۔ اور وادیٔ بالاکوٹ میں جو خون بہایا گیا آزادیٔ وطن کے لئے یہ سب سے پہلا خون تھا۔ لیکن یاد رکھو کہ صداقت و دیانت پر مبنی تحریکیں قوتِ قاہرہ و جابرہ کے مقابلے میں دب جایا کرتی ہیں ختم نہیں ہوا کرتیں۔ اسی طرح یہ تحریک بھی وقتی طور پر دب گئی مگر ختم نہیں ہوئی۔ اس کی دبی ہوئی چنگاریاں ملک میں موجود تھیں جو ۱۸۵۷ء میں دوبارہ مشتعل ہوئیں اور راہنمایانِ تحریک نے جو بیج بویا تھا وہ ۱۸۵۷ء میں برگ و بار لایا۔ درحقیقت یہاں پر پچھلی تحریک پہلی ہی تحریک کا نتیجہ ہے۔ آزادیٔ وطن کے لئے جتنی بھی تحریکیں چلائی گئیں وہ ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھیں جو اپنے وقت اور موقع و محل پر ظاہر ہوتی رہیں۔ ان سب سے مل کر آزادیٔ وطن کی ایک زنجیر تیار ہو گئی اب ہم پہلی تحریک کا حال اشارۃً یہاں ختم کرتے ہیں۔ اور دوسری تحریک کا اجمالی ذکر کرتے ہیں۔

تحریکِ آزادی نمبر ۲

۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کے متعلق حکومتِ برطانیہ کے دور میں صحیح واقعات کا لکھنا جرم تھا۔ جو کچھ مؤرخینِ مغرب نے لکھ دیا اس کے اظہار تک کی بھی اجازت نہ تھی۔ اس لئے یہ کہنا زیادہ بیجا نہ ہوگا کہ ۱۸۵۷ء کا جہادِ حریت دنیائے تاریخ میں اب تک تہ بہ تہ پردوں میں مستور ہے۔ اب جب کہ ملک آزاد ہو چکا تو

مؤرخین اور مصنفین کا قلم تو آزاد ہے۔ مگر تاریخی معلومات اور واقعات و حقائق مرورِ زمانہ کے باعث دُنیا کے ذہنوں سے محو ہو چکے ہیں۔ اس لئے اب مؤرخ کے لئے صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ جاتا ہے کہ اجمالی اشارات سے تاریخی واقعات کا استنباط کیا جائے اور اجمال سے تفصیل پایا کی جائے۔ اور مؤرخ اس طریق پر کام کر رہے ہیں۔ اُردو لٹریچر میں بہت سے واقعات پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مگر تحریک کا ایک پہلو اب تک منصۂ شہود پر نہیں آیا۔ اور کسی مؤرخ نے اس موضوع پر قلم نہیں اُٹھایا۔ وہ یہ کہ اتنی منظم اور ہمہ گیر تحریک کہ راس کماری سے درۂ خیبر تک کے امصار و بلاد کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ کوئی شہر اور قصبہ اور کوئی گاؤں اور دیہات اس سے باہر نہ رہا ہو۔ پھر سول میں بغاوت، پبلک میں بغاوت، فوجوں میں بغاوت یہاں تک کہ وفادارانِ برطانیہ و کاسہ لیسانِ ازلی بھی بغاوت پر مجبور ہو جائیں پھر رازداری اور پیغام رسانی کا منصوبہ اتنا منظم کہ کراماً کاتبینِ برطانیہ کی نگاہوں سے اوجھل ہر شخص اور ہر فرد تک اپنا پیغام پہنچایا جا رہا ہو۔ آخر وہ چپاتیوں کا معاملہ کیا تھا جو اضلاع یو۔پی سے شروع ہو کر پنجاب، سرحد، سندھ اور دکن و بنگال تک پہنچ گیا۔ پھر ہاتھی سوار اور ایک بوڑھے کی داستان آپ نے تاریخوں میں پڑھی ہو گی۔ اور وہ سبز پوش بڑھیا جو ہندوستان کے کونے کونے میں نوجوانوں کو ابھارتی اور خود میدانِ جہاد میں مردانہ وار مقابلہ کرتی رہی۔ اور دہلی میگزین کا وہ ملازم سپاہی جو بقول ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ہندوستان کی ہر چھاؤنی میں اپنا پیغام پہنچاتا رہا لیکن سی۔آئی۔ڈی کو

خبر تک نہ ہوئی۔ اور پھر وہ قلمی اشتہارات کا سلسلہ جو دہلی کے در و دیوار پر چسپاں ہوتے رہے۔ کیا انگریزی خفیہ پولیس اس کی تہہ تک پہنچی کہ اس کے پیچھے کون سا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ اشتہار ہے جو شاہ ایران کی جانب سے ہندوستان کے کونے کونے میں بھیجا جاتا ہے کیا انگریزی سی آئی ڈی نے یہ معلوم کیا کہ اس کے پس منظر میں کون سے حقائق پوشیدہ تھے۔ سب سے زیادہ عقدۂ لاینحل یہ مسئلہ ہے کہ ہندو مسلم جو مذہباً معاشرۃً، صحافۃً و ثقافۃً ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے مقابل اور دشمن ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ پبلک میں یکجان اور دو قالب ہو جاتے ہیں بلکہ فوجوں میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بھائی بن جاتے ہیں اور یکجا مل کر کھانا کھانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہندو گائے کا گوشت کھا کر اس پر نازاں ہیں اور مسلمان اُن کے تہواروں میں شریک ہو کر خوشیاں مناتے ہیں۔ حالانکہ فوجوں میں باہر کا کوئی لیڈر اور قائد جا کر تبلیغ نہیں کر سکتا بلکہ انگریزی نظام میں تو فوجوں کی دُنیا ہی دوسری ہے پھر ان کو اس طرح منظم اور متحد کس نے کیا۔ انگریزی سی آئی ڈی کے لئے یہ مسئلہ اب تک معمّا بنا ہوا ہے یہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات دلائلِ واضحہ اور براہین قاطعہ ہیں اس بات پر کہ اس تحریک کے پیچھے کوئی طاقتور ہاتھ تھا اور کوئی مدبر ترین دماغ تھا جو اس کو چلا رہا تھا آخر وہ ہاتھ کون سا تھا، وہ دماغ کون سا تھا اور اس تحریک کا بانی اور محرک کون تھا۔ یہی وہ اہم مسئلہ ہے جس پر آج تک کسی مورخ نے قلم نہیں اُٹھایا۔ ہم کسی دوسری کتاب میں اس مسئلے پر مفصل بحث کریں گے۔

اور دلائل سے ثابت کریں گے کہ اس تحریک کے محرک اور قائد و لیڈر وہ علماء تھے جو شاہ عبدالعزیز رح اور سید احمد شہید رح سے وابستہ تھے۔ آخر آپ نے یہیں سوچا کہ صوبۂ الہ آباد کے گورنر مولانا ولایت علی صاحب اور صوبہ بریلی کے گورنر مولانا امام فضل حق صاحب اسی طرح گورنر پٹنہ مولانا یحییٰ علی صاحب اور وزیر اعظم مولانا احمد اللہ صاحب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان کے وائسرائے بخت بہادر صاحب یہ علماء نہ تھے تو اور کون تھے؟ اور پھر کامیابی تحریک کے وقت یہ اتنے بڑے بڑے عہدوں پر قابض ہوتے ہیں اور ڈاکٹر ہنٹر بیوقوف تو نہ تھا جو اپنی سات سالہ تحقیق کے بعد یہ رپورٹ لکھتا ہے کہ ان سب تحریکوں کے کرتا دھرتا اور بانی سب وہابی مولوی تھے اور اب بھی اگر تم اُن کا قلع قمع نہ کرو گے تو ہمیشہ ہندوستان میں سازشوں کا سلسلہ قائم رہے گا۔ غرضکہ ولی اللّٰھی خاندان کے پسماندگان علماء نے دوسری تحریک آزادی ۱۸۵۷ء میں چلائی جو ہماری بدقسمتی اور سکھوں اور مسلمان رؤسائے پنجاب کی غداری سے دشمنوں کی نگاہ میں ختم ہو گئی اور درحقیقت دب گئی جس میں ہندوستان کے معزز خاندانوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اذلّہ اور کمینہ لوگوں کو مال و دولت اور اقتدار کا مالک بنا دیا گیا۔ سر طاس کی کتاب تذکرۂ رؤسائے پنجاب پڑھیے اور اندازہ لگائیے کہ آج جو لوگ ہماری قسمت کے مالک ہیں اور اقتدارِ حکومت پر قابض ہیں یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں ملک و ملت سے غداری کر کے اپنی ریاستوں اور جاگیروں کی بنیاد مجاہدین کی قبروں پر رکھی ہے۔ بہر حال ۱۸۵۷ء کی تحریک کا اجمالی ذکر کرنا مقصود

تھا وہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد تیسری تحریک جو "تحریک ریشمی خط" کے نام سے مشہور ہے اور جو ۱۹۱۴ء میں چلائی گئی تھی اب ہم تفصیل سے اس پر بحث کرتے ہیں اور وہی ہماری بحث کا موضوع ہے۔ اس بحث کو ہم تین حصوں میں منقسم کرتے ہیں۔ پہلے حصے میں تحریک کے علل و اسباب اور محرکات و عوامل سے بحث کریں گے۔ دوسرے حصے میں تحریک کے تفصیلی حالات بتائیں گے جس کے ضمن میں بانیٔ تحریک اور مجاہدین تحریک کے حالات تفصیل سے آجائیں گے اور تیسرے حصے میں ناکامی کے بواعث اور اسباب سے بحث کریں گے جس کے ضمن میں بعض غداران ملک و ملت کے نام بھی آجائیں گے؛

وما توفیقی الا باللہ!

بابِ اوّل

تحریکِ ریشمی خط کے اسباب کا بیان

تمہید

برطانوی مظالم پر طائرانہ نگاہ

تحریک ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز نے اس ملک میں لوٹ کھسوٹ اور ظلم و تشدد، بربریت اور وحشت کا وہ مظاہرہ کیا کہ فرعون اور نمرود بھی دیکھیں تو شرما جائیں۔ ہندوستانیوں کو ہر لحاظ سے تنگدست مفلس اور مفلوک الحال بنایا گیا۔ بڑے بڑے ذی عزت خاندان جو کل تک لعل و جواہر سے کھیلتے تھے آج وہ نان شبینہ کے محتاج اور در در کے گداگر ہو گئے تھے فوجیوں کی لوٹ کھسوٹ تو الگ تھی بقول مرزا غالب مرحوم صرف دہلی شہر کو آٹھ دن متواتر سکھ اور گورے فوجی لوٹتے رہے۔ لیکن کیا صرف دہلی شہر کو لوٹا گیا؟ نہیں، بلکہ ہندوستان کے ہر شہر اور گاؤں میں یہی سلسلہ جاری رہا بمبئی، لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، آگرہ، میرٹھ، پانی پت، گڑگاؤں، لدھیانہ،

سیالکوٹ اور پشاور تک فوجی اوباشوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی کہ وہ لُوٹ مار کریں۔ پھر ملک میں کاشت کاروں پر لگان اور ٹیکس کی وہ بھرمار کی گئی کہ ملکی لوگ غریب سے غریب تر ہوتے گئے۔ تجارت میں ملکی اور ولایتی کا امتیاز برت کر تاجروں کے کاروبار کو ختم کر دیا گیا۔ ہندوستان کے وہ صنعت کار جو دُنیا بھر میں اپنی صنعت کاری اور مصنوعات میں مشہور تھے اُن کے کاروبار کو طرح طرح کی مکاری اور فریب کاری سے ختم کر دیا گیا۔ غرضیکہ ایک طرف ملک کو دیوالیہ بنا دیا گیا اور دوسری طرف ملک میں خونریزی اور قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا گیا۔ ان تہذیب کے ٹھیکیداروں نے ہندوستان میں ایسے ایسے مظالم کا مظاہرہ کیا کہ انسانیت انگشت بدنداں ہو کر رہ گئی۔ تہذیب وتمدن اور اخلاق کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں نے ننگِ انسانیت، وحشت اور درندگی کا دنیا کو وہ نمونہ دکھایا کہ چشمِ فلک نے بھی کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ عدل وانصاف پر ٹیکس لگائے گئے۔ کسی ذی عزت ہندوستانی کی جان ومال اور عزت وآبرو تک محفوظ نہ رہی۔ ہندوستانیوں کے مذہب پر ڈاکے ڈالے جانے لگے۔ اسکولوں، کالجوں اور ہسپتالوں میں عیسائیت کی تبلیغ ہونے لگی۔ بازاروں کے بڑے بڑے چوکوں میں مذہبِ عیسائیت کی صداقت کے بورڈ آویزاں کئے گئے۔ یورپ سے پادری منگوا کر ہندوستان کے کونے کونے میں مناظروں کے چیلنج کئے گئے۔ پادری اور انگریز افسر باقاعدہ جلسے منعقد کرتے اور ان میں ہندوستانیوں کے مذہب پر اعتراضات کئے جاتے اور اُن کے پیشواؤں کا تمسخر اُڑایا جاتا تھا۔ خصوصاً مسلمانوں کے خلاف ایک منظم تحریک شروع کی گئی۔ کوئی شخص داڑھی

والا نظر آتا تو اس کو مولوی سمجھ کر گولی سے اڑا دیا جاتا تھا۔ اس کا مولوی ہونا ہی اس کے مجرم ہونے کے لئے کافی ثبوت تھا۔ کوئی اسلامی مدرسہ نہیں جاری کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ اسلامی مدارس کو بغاوت کا اڈہ سمجھا جاتا تھا۔ دہلی کی اسلامی یونیورسٹی جو مدرسہ رحیمیہ کے نام سے مشہور تھی جس کے سرپرست شاہ ولی اللہ رح اور شاہ عبدالعزیز رح اور اس کے بعد شاہ عبدالغنی رح تھے مسلمانان ہند کی یہی مرکزی یونیورسٹی تھی جس نے بڑے بڑے فضلاء مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا فضل الحق خیر آبادی جیسے نزاد پیدا کئے تھے اس کی عمارت کو توپوں سے اڑا دیا گیا اور زمین ایک ہندو لالہ رام کشن داس کے ہاتھوں فروخت کی گئی جہاں ۱۹۴۷ء یعنی تقسیم ملک اور آزادی کے وقت تک کوچہ لالہ رام کشن داس کا بورڈ آویزاں تھا۔ اور مسجد اکبری جہاں شاہ عبدالقادر صاحب رح نے بیٹھ کر چالیس سال درس قرآن دیا تھا اور وہاں ہی قرآن مجید کا اُردو میں وہ ترجمہ کیا تھا جو آج تک مسلمانان پاک و ہند کے لئے مایۂ ناز دولت سمجھی جاتی ہے۔ اس مسجد کو اس جرم کی پاداش میں گرا دیا گیا کہ یہاں سے قرآن داں اور آزادئ وطن کے پرستار علماء پیدا ہوئے۔ پھر صرف گرانے پر ہی اکتفا نہیں کی گئی بلکہ اس کی جگہ ایک کلب قائم کیا گیا جو آج تک موجود ہے اللہ اللہ جہاں قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی وہاں شراب پی جانے لگی۔ پھر ملک میں سی آئی ڈی کا ایسا جال بچھا دیا گیا کہ کوئی آزادئ وطن کا نام تو کیا لیتا بلکہ آزادی کے لئے دعا کرنا بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ اور اگر کوئی یہ دعا کرتے ہوئے پکڑا جاتا کہ اللہ تو ظالموں سے مظلوموں کو نجات دے تو اس کو باغی سمجھ کر

گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا تھا۔ حقیقتہ دیوبند کے ایک بزرگ کی داستان تاریخوں میں آج تک محفوظ ہے کہ وہ سحری کے تہجدوں میں جب مظلوموں کے اقبال اور ظالموں کے زوال کے لئے دعا مانگنے کا ارادہ کرتے تھے تو پہلے مکان کی چھت پر جا کر چاروں کونوں میں دیکھ لیتے تھے کہ کوئی سی آئی ڈی کا آدمی تو چھپا ہوا نہیں پھر آکر دعا مانگتے تھے۔ غرضیکہ ملک میں خوف اور دہشت طاری تھا۔ ہم ان وجوہات کو اب تین حصوں میں منقسم کر کے ہر ایک پر خود انگریز مؤرخین کے حوالے سے بحث کرتے ہیں۔ پہلے حصے میں سیاسی وجوہات سے بحث کریں گے اور دوسرے حصے میں اخلاقی محرکات وعوامل کو بیان کریں گے۔ اور تیسرے حصے میں معاشی اسباب وبواعث سے بحث کریں گے؛

مظالمِ سیاسیہ کا بیان

سر سید صاحب مرحوم برطانوی نظام حکومت کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں: کہ انگریزی حکام کے غرور اور تکبر نے تمام ہندوستانیوں کو ان کی جانب سے برگشتہ و برانگیختہ کر دیا ہے۔ کیا ان کی بدمزاجی اور بے پروائی نے ہندوستانیوں کے دل میں بیجا دہشت نہیں ڈالی۔ کیا ہماری گورنمنٹ کو معلوم نہیں ہے کہ بڑے سے بڑا ذی عزت ہندوستانی حکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں رہتا ہے۔ اور کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ شریف اہل کار صاحب کے سامنے مسل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے اور صاحب کی بدمزاجی اور تلخ کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل ہی دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا ہے: ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی۔ اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے۔"

(اسباب بغاوت ہند صفحہ ۲۰)

سید صاحب مرحوم تھوڑے سے آگے چل کر لکھتے ہیں: کہ لوگ گورنمنٹ کے موجودہ قوانین کو میٹھا زہر یا ریشم کی چھری یا ٹھنڈی آنچ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے

ہیں تو کل نہیں اور کل ہیں تو پرسوں نہیں اور پھر اس پر طرفہ تماشا یہ کہ ہندوستانیوں کی مفلسی کے باوجود عدالت کی چارہ جوئی پر سٹامپ لگا دیا گیا۔ جو ناقابلِ برداشت تھا۔"

(اسباب بغاوتِ ہند ص۴۳)

آزادی مذہب

سید صاحب اور آگے چل کر فرماتے ہیں: کہ ہماری گورنمنٹ نے اپنی ناعاقبت اندیشی سے ہندوستانیوں کے مذہب پر حملے شروع کئے۔ بتکرار مذہب کی کتابیں بطور سوال و جواب مفت تقسیم ہوتی تھیں جن میں دوسرے مذہب کے پیشواؤں کی توہین ہوتی تھی۔ پادری لوگ پولیس کے کانسٹبلوں کو ساتھ لے کر میلوں میں ہندوؤں کی کتھاؤں اور مسلمانوں کی مجالس وعظ وغیرہ میں جاکر اعتراضات کرتے تھے اور مذہبی پیشواؤں کی برائی اور ہتک کرتے تھے جس سے لوگوں کو دلی تکلیف پہنچتی تھی مگر خوف کے باعث خاموش رہتے تھے۔

(اسباب بغاوت ہند ص۴۲)

سید صاحب ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ ملک میں بیشتر مشنری اسکول بہت جاری ہوئے ان میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ یہ سرکار کی جانب سے عیسائی بنانے کا جال ہے۔ اور اس کا ثبوت بھی ان کو مل گیا کہ امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا اور کم عمر طالب علموں سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے اور تمہارا نجات دہندہ کون ہے۔ اگر وہ عیسائی مذہب کا جواب دیتے تھے تو ان کو انعام ملتا تھا۔ لوگ افلاس سے مجبور ہو کر بچوں کو کسی قابل بنانے کے لئے ان اسکولوں میں داخل کرتے تھے۔

اور کسی کو اعتراض کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ان اسکولوں کے وہ ڈپٹی انسپکٹر جن کو لوگ کالا پادری کہتے تھے ان ہی کے سرٹیفیکیٹ پر ملازمت موقوف کر دی گئی تھی معمولی ملازمت بھی اُن کے سرٹیفیکیٹ کے بغیر نہ ملتی تھی۔

(اسباب بغاوت ہند ص۱۱۱)

سید صاحب ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ حکومت کی کونسلوں میں ہندوستانیوں کا کوئی حصّہ نہیں تھا جو اپنے دکھ درد کو پیش کر سکیں۔ حکام جابر، متکبّر اور خود غرض ہوتے ہوئے ہندوستانیوں کی طبیعت، اُن کے رجحانات اور اُن کی ضرورتوں سے قطعاً ناواقف تھے اور اعلیٰ ملازمتوں سے ہندوستانیوں کو یکسر محروم کر دیا گیا تھا۔

(اسباب بغاوت ہند ص۱۱۱)

یہی سید صاحب ملک کی بے بسی کا نقشہ ایک دوسرے مقام میں اس طرح کھینچتے ہیں کہ حکام کے ڈر سے کسی کو سچی بات اور بالخصوص وہ بات جو حکام کے مزاج کے مخالف ہو کہنے کی ہمّت نہ تھی۔ ہر شخص ملازم اور درباری رئیس کے ڈر کے مارے خوشامد کی باتیں کرتا تھا۔ نہ کوئی جدید قوانین کے نقصان بتانے والا تھا اور نہ کوئی رعایا کا غم خوار بجز ان کے لہو کے جو جل جل کر اُن کے بدن میں رہتا تھا اور بجز اُن کی بے کسی کے جس پر وہ رو رو کر چپ رہتے تھے۔

(اسباب بغاوت ہند بحوالہ روشن مستقبل ص۲۶۶)

یہ حالات جو سرسید صاحب مرحوم نے بیان کئے ہیں بیشک ۱۸۵۷ء سے

پہلے کے ہیں لیکن کیا ۱۸۵۷ء کے بعد ان حالات کی اصلاح ہو گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد حالات اور ابتر ہو گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء سے جنگ عظیم اوّل تک کا درمیانی دور نہ یہ کہ حالات سابقہ پر قائم رہا۔ بلکہ انگریزی حکومت کا ظلم وستم اور بڑھا اور بڑھتا چلا گیا۔ گورنمنٹ کے ظالمانہ نظام حکومت کے شکنجے میں لوگوں کو کس دیا گیا آپ خود اندازہ لگائیے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد حکومت برطانیہ کی جانب سے جو جو مظالم ہوئے کیا اُن کے نتیجے میں ملک کے سیاسی حالات کو سنورنا تھا نہ کہ اور بگڑنا۔ جس ملک میں پھانسی پر لٹکانا، سؤر کی کھال میں زندہ انسانوں کو جلانا اور توپوں کے سامنے کھڑا کر کے توپوں سے اُڑا دینا۔ اور سؤر کی چربی مل کر آگ کے دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹکا دینا اور لوہے کی گرم سیخوں سے داغ داغ کر تڑپتی لاشوں کا ہیبت ناک کھیل دیکھنا اور اسی طرح کے دوسرے مظالم کو عین تہذیب وتمدن سمجھا جائے۔ اس ملک کے سیاسی حالات کا نقشہ کیا ہوگا۔ کسی مؤرخ کے بس میں ہے کہ اُس کا نقشہ کھینچ سکے۔ اور دُنیا کو بتائے کہ یہ مجبوروں، بے کسوں، لاچاروں اور بے بسوں کا ملک کن کن حالات سے دوچار ہوا اور ملک کے باشندوں نے ان حالات کا مقابلہ کس طرح کیا۔ یہ آہوں اور نالوں کی داستان ہے جس کی تصویر کھینچنے سے ہم معذور ہیں۔ صرف انگریز مورخین کے چند اقتباسات نقل کر دیتے ہیں۔ آپ ان کو پڑھ کر غور کیجئے اور اندازہ لگائیے کہ ۱۸۵۷ء سے جنگ عظیم اوّل تک کا یہ درمیانی وقفہ ہمارے اکابر نے کس طرح گزارا۔

اور اس تاریک دور میں انھوں نے ان ناموافق حالات کا کیسے مقابلہ کیا۔ اور ان ناموافق حالات کو بدل کر کیسے سازگار بنایا۔ یہ ایک خونی داستان ہے جس کو ہم آئندہ اوراق میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

میرٹھ کے ایک واقعے کا فوٹو ایک انگریز مؤرخ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچا ہے۔

"بندوقوں اور سنگینوں کے پہرہ میں پچاسی نوجوانوں کو ان کے اپنے فوجی لباس میں سپاہیوں کی حیثیت میں فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور سزا کو بلند آواز سے سنایا گیا جس کا مقصد سپاہیوں کو بدکار مجرموں کی فہرست میں داخل کرنا تھا۔ فوجی نشانات ان سے چھین لئے گئے۔ وردیاں اُن کی پشت کی طرف سے پھاڑ دی گئیں۔ پھر لوہار زنجیریں اور اوزار لے کر آگے بڑھے اور آناً فاناً میں وہ پچاسی نوجوان اپنے ساتھیوں کے اس عظیم الشان مجمع کے سامنے انتہائی بے عزتی کے تمام روشن اور ظاہر علامات کے ساتھ یعنی ہتکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے نظر آتے۔ یہ نہایت دردناک اور ذلت آفریں مظاہرہ تھا جس سے سپاہی بیحد متاثر ہوئے۔ بالخصوص جب انھوں نے اپنے بدقسمت ساتھیوں کی اس ناگفتہ بہ حالت اور مایوسانہ انداز کو دیکھا، حالانکہ بعض ان میں سے اپنی پلٹن میں نہایت ہر دلعزیز تھے اور متعدد دفعہ انھوں نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر برٹش حکومت کی ترقی اور وفاداری کا ثبوت بھی دیا تھا۔ قیدیوں نے ہاتھ اٹھا کر بلند آواز سے جرنیل سے گڑگڑا کر رحم کی التجا کی کہ ان کو اس شدید مصیبت اور ہلاکت سے بچالیا

جائے۔ پھر یہ دیکھ کر کہ اس طریقے سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوسکتا وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور اس بے عزتی کو خاموشی سے برداشت کرنے پر انھیں شرمندہ کیا اور غیرت دلائی۔ اس وقت ایک بھی سپاہی اس میدان میں ایسا موجود نہ تھا جس نے اپنے سینے میں اس واقعے سے رنج اور نفرت کے جذبات اُٹھتے ہوئے محسوس نہ کئے ہوں۔ لیکن بھری ہوئی میدانی توپوں اور بندوقوں اور سواروں کے چمکتے ہوئے خنجروں کی موجودگی میں حملہ کرنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ قیدیوں کو اُن کی کوٹھڑیوں میں لے گئے جن پر پہرہ دینے کے لئے ان ہی کے ساتھیوں کو متعین کیا گیا۔

(انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ صہ ۲۸)

مذکورہ بالا واقعے سے اندازہ لگائیے کہ کس طرح ایک طرف قوتِ جابرہ اور قاہرہ کا تسلّط ہے۔ اس کی وحشت اور بربریت، ظلم اور درندگی، جور و ستم اپنے عروج پر ہے اور دوسری طرف بیکسی، مظلومی، بےبسی اور مجبوری بیچارگی اور درماندگی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

کوپر صاحب ڈپٹی کمشنر امرتسر لکھتا ہے کہ:

مسٹر مونٹگمری کے حکم سے پنجاب میں بھی جہاں عام طور پر لوگ ابھی وفادار ہیں ایک سکھ پلٹن کے صوبے دار۔۔۔ سوار پولیس کے رسالدار اور ایک داروغہ جیل کو فرض کی کوتاہی کے الزام میں پھانسی پر لٹکانا ضروری سمجھا گیا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بخوبی ذہن نشین ہوجائے کہ پنجاب کے حکام

ابتدا ہی میں بلا توقف متشددانہ کارروائی کرنے کی پالیسی سے لوگوں کے دلوں میں اپنا رعب قائم کرنا چاہتے ہیں، صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے اس نیم وحشی ملک میں اپنا وقار قائم رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف ایک سخت پالیسی کا مقصد یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ حکومت رعایا سے غیر مشروط اور غیر مبہم وفاداری چاہتی ہے نہ کہ رعایا کی بردباری کے بھروسے پر جو ایک حد تک گورنمنٹ کے استقلال کی شکست کے مرادف ہے۔

(تصویر کا دوسرا رُخ ص۲۴)

غور کیجئے صرف اپنا رعب اور وقار قائم کرنے کے لئے گورنمنٹ اپنی آزاد رعایا کے وفادار انسانوں کو بھی پھانسی پر لٹکاتی ہے اور پھر اس سزا کو معمولی تصور کیا جاتا ہے۔ گویا اس کے لئے کسی بڑے جرم کی ضرورت ہی نہیں۔

یہی کوپر صاحب لکھتے ہیں کہ جو لوگ ہمارے جیل خانوں میں قید ہیں اُن کی نجات کا راستہ نہایت آسان ہے۔ یعنی باغیوں کو دیکھ کر نعوذ نمکسن کا نعرہ بلند کیا جاتا تھا۔ کہ پھانسی پر لے چلو۔

(تصویر کا دوسرا رُخ ص۲۵)

گویا قیدیوں کی نجات کا راستہ صرف ایک ہی تھا کہ پھانسی پر لٹکائے جائیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قید زندگی سے نجات پائیں۔

ایک پادری کی عورت نہایت فاتحانہ انداز میں لکھتی ہے کہ جب بہت سے باغی گرفتار کر کے لائے گئے تو اُن کو حکم دیا گیا کہ گرجا کے فرش کو

صاف کریں۔ مگر باوجودیکہ یہ لوگ اپنے معتقدات کی بنا پر اس ستم کا کام خلاف سمجھتے تھے پھر بھی سنگین کی نوک سے انھیں یہ حقیر کام کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ان میں سے بعض نے نہایت پھرتی سے اس کام کو سرانجام دیا محض اس خیال سے کہ شاید پھانسی کی سزا سے بچ جائیں لیکن بے سود۔ کیونکہ وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔

(تصویر کا دوسرا رخ ص۲۵)

مجینڈی صاحب لکھتا ہے کہ:

وہ رات ہم نے مسجد پر پہرہ دیتے بسر کی۔ اور ہمارا زیادہ تر وقت ان قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے یا پھانسی پر لٹکاتے میں گزرا۔ جن کو ہم نے صبح کے وقت گرفتار کیا تھا۔ (تصویر کا دوسرا رخ ص۲۶)

یہ لاہور کی شاہی مسجد کا واقعہ ہے۔ یہ قیدی ضلع شیخوپورہ، گجرانوالہ اور منٹگمری سے گرفتار کر کے لائے گئے۔ ان کے لئے شاہی مسجد میں پھانسی کا انتظام کیا گیا۔ ان کو مسجد میں لا کر کیوں سزا دی گئی؟ صرف اس بنا پر کہ یہ مسلمان تھے۔ اور مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگانے کے لئے یہ حرکت کی گئی تھی۔ مسجد کیا تھی گویا ایک مقتل اور معرکہ کارزار تھا جس میں بے گناہوں کا خون بہایا جا رہا تھا۔

اخبار "ٹائمز" کا ایڈیٹر لکھتا ہے کہ بغاوت کے اعلان سے ۴۸ گھنٹے کے اندر اندر پانچسو آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ یہ بیچارے طوفان سے ڈر کر گھروں سے بھاگ نکلے تھے۔ نیز محاصرہ کے وقت بھوک اور مسافت کی تکلیف

اور صدمے سے ان کی حالت نیم مردہ انسانوں کی تھی۔

(تصویر کا دوسرا رُخ ص۵۹)

ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ ہندوستانیوں کو اس کثرت سے پھانسیاں دی گئیں جو بیان سے باہر ہے۔ الہ آباد سے کانپور آتے ہوئے دو دن کے اندر ۴۲ آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ اور ۱۲ آدمیوں کو تو صرف اس جرم میں پھانسی دی گئی کہ جب فوج مارچ کرتی ہوئی اُن کے سامنے سے گزری تو اُن کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے۔ جہاں جہاں فوج پڑاؤ کرتی تھی وہاں قرب و جوار کے تمام دیہات کو نذرِ آتش کر دیتی تھی۔ یہ کہنا کہ یہ کانپور کے مظالم کے حادثے کا جواب تھا صحیح نہیں۔ کیونکہ کانپور کا شیطانی واقعہ ان حوادث کے بہت بعد پیش آیا۔

(تصویر کا دوسرا رُخ ص۶۰)

مسٹر ٹامسن صاحب ایک جگہ جوش میں آکر پُرزور الفاظ میں رقم طراز ہوتے ہوئے فرماتے ہیں:

آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو بھی پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا

(تصویر کا دوسرا رُخ ص۶۳)

ایک انگریز افسر اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے اپنی بہادری اور جرأت کو اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ میں نے ایک گواہ سے کہا میں تمھاری جان بخشی کر دیتا ہوں

بشرطیکہ تم اس کے عوض میں کوئی تین ایسے نام بتاؤ جن کو تمہارے عوض میں پھانسی دی جائے۔ چنانچہ اس نے بتائے اور ان کو پھانسی دی گئی۔

(تصویر کا دوسرا رُخ صـ۶۴)

ایک انگریز رقم طراز ہے کہ:

دہلی میں خونریزی کے عادی سپاہیوں نے جوشِ انتقام کو فرو کرنے کے لئے پھانسی دینے والے جلادوں کو رشوت دے کر آمادہ کیا تھا کہ وہ پھانسی کے تختے پر زیادہ دیر تک لٹکتے رہنے دیں۔ تاکہ لاش کے تڑپنے کی دردناک کیفیت دیکھ کر جسے وہ ناچ کہتے تھے اپنی خونخوار طبائع کے لئے دلچسپی کا سامان بنا سکیں۔ جھجر کے نواب صاحب کو جان دینے میں بہت عرصہ لگا۔

(تصویر کا دوسرا رُخ صـ۶۵)

ایک اور انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ:

بنارس اور الہ آباد میں کانپور کے واقعے سے پہلے ایک موقع پر چند نوجوان لڑکوں کو محض اس بنا پر پھانسی دی گئی کہ انھوں نے شوقیہ طور پر باغیوں کی جھنڈیاں اٹھا کر بازاروں میں منادی کی تھی یہ سزا سے موت دینے والی عدالت کے ایک افسر نے پُرنم آنکھوں سے کمانڈنگ افسر کے پاس جاکر درخواست کی کہ ان نابالغ مجرموں پر رحم کرکے پھانسی کی سزا کو تبدیل کردیا جائے۔ لیکن بے سود۔ اس تمام سلسلے میں بے شمار ایسے واقعات ملیں گے جن میں اس قسم کی نمائشی عدالتوں تک سے بھی گریز کیا گیا اور بے گناہ انسانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ (تصویر کا دوسرا رُخ صـ۶۵)

ٹامسن صاحب جوش میں آکر فرماتے ہیں کہ :

پھانسیاں دینے کے لئے رضاکارانہ ٹولیاں بنائی گئیں جنھوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے دیہات کا دورہ کیا۔ اس حالت میں کہ ان کے پاس پھانسی دینے کا سامان بھی مکمل نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کے طریقے سے پوری واقفیت تھی۔ چنانچہ ان میں سے ایک شریف آدمی اپنی کامیابی کا اس طرح فخریہ اظہار کرتا تھا کہ ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کیا کرتے تھے یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے تھے اور اوپر سے رسہ ڈال کر ہاتھی کو ہنکایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ملزم اس طرح تڑپنے اور جان کنی کی حالت میں اکثر اوقات انگریزی کے آٹھ (8) کے ہندسہ کی دل چسپ شکل بن کر رہ جاتا تھا۔

(تصویر کا دوسرا رخ صـ۶۴)

ایک انگریز مؤرخ حقائق کو بے نقاب کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے کہ :

لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا۔ چنانچہ ہر ہندوستانی کو قطع نظر اس کے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی بیدریغ تہ تیغ کیا گیا یہاں تک کہ نہ کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا۔ اور نہ اس قسم کا کوئی تکلف روا رکھا جاتا بلکہ محض سیاہ رنگ ہی اس کے مجرم ہونے کے لئے کافی دلیل سمجھی جاتی اور ہلاکت کے لئے ایک رسہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ (تصویر کا دوسرا رخ صـ۶۵)

ٹامسن صاحب رقم طراز ہیں کہ :

"دہلی وغیرہ میں شہر کے بلند مقام پر ایک چوگوشہ سولی نصب کی گئی تھی جہاں پانچ اور چھ اشخاص کو روزمرہ پھانسی دی جاتی تھی جس کے قریب ہی انگریز افسران سگرٹوں کے کش پر کش اڑاتے ہوئے لاشوں کے تڑپنے کے نظاروں میں محو دکھائی دیتے تھے۔"

(تصویر کا دوسرا رُخ ص ۶۲)

مسٹر نکلسن مسٹر ایڈورڈز کو ایک خط میں لکھتا ہے :

"دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیے جس کی رُو سے ہم انھیں زندہ بھی جلا سکیں۔ یا زندہ ان کی کھال اُتار سکیں، یا گرم سلاخوں سے اُن کو اذیت دے کر قتل کے گھاٹ اتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کئے دیتا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ کاش میں دُنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں سنگین انتقام لے کر دل کی بھڑاس نکال سکوں۔" تہذیب و اخلاق کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ حیا کو بھی ان لوگوں نے بالائے طاق رکھ دیا تھا اور انسانیت سے بیزار ہو کر خونخوار درندہ بن چکے تھے۔"

(تصویر کا دوسرا رُخ ص ۳۸)

ٹامسن صاحب آگے فرماتے ہیں کہ :

"نکلسن کو اپنی آرزو کے پورا ہونے میں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔

مسٹر موبری تھامسن نے اپنے بعض قیدیوں کی دردناک سرگزشت سرہبز کاٹن کو ذیل کے الفاظ میں سنائی:

شام کے وقت ایک سکھ اردلی میرے خیمے میں آیا۔ اور سلام کر کے پوچھنے لگا آپ غالباً یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہیں فوراً لیک کے قیدیوں کے خیمے میں گیا جہاں ان بدبخت مسلمانوں کو عالمِ نزاع میں بے حال دیکھا یعنی مشکیں ان کی بندھی ہوئی تھیں اور وہ برہنہ زمین پر لیٹے ہوئے تھے اور سر سے لے کر پاؤں تک تمام جسم کو گرم تانبے سے داغ دیا گیا تھا۔ اس روح فرسا نظارہ کو دیکھ کر میں نے اپنے پستول سے اُن کا خاتمہ کر دینا ہی اُن کے حق میں مناسب سمجھا۔"

(تصویر کا دوسرا رُخ صـ۴۰)

مسٹر ٹامسن صاحب کو ایک جگہ سخت غصہ آتا ہے اور اپنے جوشِ حق بیانی میں لکھتے ہیں کہ:

"ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ بدنصیب قیدی کے جلتے ہوئے گوشت سے مکروہ بدبو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی۔ انیسویں صدی میں جب کہ تہذیب اور شائستگی پر ناز کیا جاتا تھا ایک ایسا دردناک نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک انسان نہایت وحشیانہ طریق سے زندہ آگ میں جلایا جا رہا ہے اور سکھ اور یوروپین نہایت اطمینان اور متانت سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر ارد گرد کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ گویا وہ ایک تفریح کا سامان تھا۔

(تصویر کا دوسرا رُخ صـ۴۱)

ٹامسن صاحب ایک اخبار سے اقتباس نقل کر کے فرماتے ہیں:
ٹائمز آف انڈیا اخبار کے فوجی نامہ نگار مسٹر رسل نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے: "چند دنوں کے بعد میں نے اُس شخص کی جلی ہوئی ہڈیوں کو اسی میدان میں پڑا پایا"

(تصویر کا دوسرا رخ صلا)

ایڈورڈ ٹامسن لکھتا ہے کہ:
"دماغ پر اس سزا کا اتنا مہلک اثر پڑتا ہے کہ بعض دفعہ تو انسان نواب معین الدین حسن کے بیانات کو جن میں اس دردناک سزا کا ذکر ہے پڑھنے یا سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا لیکن گورنمنٹ بنگال کے سرکاری کاغذات میں اب بھی ایسی دستاویزات محفوظ ہیں جن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز کثرت سے اس ہولناک سزا کا استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ ایک افسر کی چٹھی ابھی تک محفوظ ہے جس میں اٹھارویں صدی کے آخری دور کے حالات پر بحث کرتے ہوئے اس دردناک طریق سزا پر ذیل کے الفاظ میں مذمت کی ہے۔ آخر کب تک ہم بنی نوع انسان کو اس دلخراش طریق پر گرم سلاخوں پر سکڑتے اور بھنتے دیکھنے کی اذیت برداشت کرتے رہیں گے۔"

(تصویر کا دوسرا رخ صلا)

مسٹر ٹامسن ایک اخبار کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:
ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر ڈی لین نے لکھا تھا: "زندہ مسلمانوں کو سؤر کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے اُن کے جسم پر سؤر کی چربی ملنا یا زندہ آگ

میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں۔ ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب بھی کبھی اجازت نہیں دیتی۔ ہماری گردنیں شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر بدنما دھبہ ہیں جن کا کفارہ لازمی طور پر ہمیں بھی ادا کرنا پڑے گا۔"

(تصویر کا دوسرا رُخ صہ۲۲)

مسٹر ٹامسن ایک انگریز افسر کی چٹھی نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

"لارڈ رابرٹس اپنی والدہ کو ایک چٹھی میں لکھتا ہے:"ہم پشاور سے جہلم تک پاپیادہ سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستے میں کچھ کام بھی کرتے آئے یعنی باغیوں سے اسلحہ چھینا اور ان کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ چنانچہ توپ سے باندھ کر اُڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے اکثر استعمال کیا ہے اُس کا لوگوں پر ایک خاص اثر ہوا یعنی ہماری ہیبت لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ اگرچہ یہ طریقہ سزا نہایت دلخراش ہے۔"

(تصویر کا دوسرا رُخ صہ۳۴)

ایک انگریز نامہ نگار کے حوالے سے مسٹر ٹامسن ذیل کا واقعہ تحریر فرماتے ہیں:" لڑائی کے اختتام پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اور یہ معلوم ہونے پر کہ اس قسم کی موت کی وہ کوئی خاص پروا نہیں کرتے تو ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اُڑا دیا گیا۔ چنانچہ ایک روز ایک توپ کے بہت بڑے دھماکے کی آواز سے ہم

چونک پڑے جس کے ساتھ ہی ایک ناقابلِ بیان دھیمی مگر وحشت ناک چیخ بھی سنائی دی۔ دریافت کرنے پر ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ یہ نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارود زیادہ بھرا ہوا تھا۔ جس کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضائے آسمانی میں اُڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے اور اس کا سر ایک راہرو پر اس زور سے گرا کہ اس کے بھی چوٹ آگئی۔ (تصویر کا دوسرا رُخ ص۳۶)

ایک انگریز کا حوالہ دے کر مسٹر ٹامسن تحریر فرماتے ہیں:

مسٹر کوپر لکھتا ہے: "پہلی اگست کو بقرعید کا دن تھا اس لئے مسلمان سواروں کو وہاں سے علیحدہ کرنے کا ایک معقول عذر تھا۔ چنانچہ اُن کو تیوہار منانے کے لئے امرتسر بھیج دیا گیا۔ اور صرف ایک عیسائی افسر وفادار سکھوں کی امداد سے ایک مختلف قسم کی قربانی کرنے کے لئے وہاں پر اکیلا رہ گیا۔ اب وہ نہایت اطمینان سے اپنا کام کرتا رہا۔ اب مشکل یہ پیش آئی کہ لاشوں کو کس طرح دبایا جائے تاکہ اُن کا تعفن نہ پھیلے لیکن اتفاق سے قریب ہی ایک ویران کنواں مل گیا۔ جب دس دس کی ٹولی کو یکے بعد دیگرے گولی سے اُڑاتے ہوئے ڈیڑھ سو سپاہی مارے جاچکے تو قتل کرنے والوں میں سے ایک شخص غش کھا کر گر پڑا۔ جو ہلاک کرنے والوں میں سب سے بوڑھا تھا۔ اس لئے آرام کرنے کے لئے تھوڑا سا وقفہ دیا گیا۔ اس کے بعد پھر قتل کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ جب تعداد

دو سو ستائیس تک پہنچ چکی تو ایک افسر نے اطلاع دی کہ باقی باغی برج سے باہر آنے سے انکار کرتے ہیں جہاں وہ چند گھنٹے بیشتر عارضی طور پر بند کر دیئے گئے تھے۔ اس برج کے دروازے کھولے گئے تو معاً ایک نہایت دردناک نظارہ دیکھنے میں آیا جس سے ہول ولس بلیک ہال کی یاد تازہ ہوئی۔ یعنی ۴۵ آدمیوں کی مردہ لاشیں لائی گئیں۔ جو خوف، گرمی، سفر کی صعوبت اور دم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہو گئے تھے۔ ان مردہ اور نیم مردہ لاشوں کو گاؤں کے بھنگیوں کے ہاتھوں قریب کے ویران کنوئیں میں پھنکوا دیا گیا تھا۔"

(تصویر کا دوسرا رخ ص۵۵)

اس کے بعد مسٹر ٹامسن فرماتے ہیں:

"لطف یہ ہے کہ جنرل لارنس اور منٹگمری وغیرہ نے اس فعل کی داد دیتے ہوئے کوپر کو مبارک باد کے خط لکھے۔"

(تصویر کا دوسرا رخ ص۵۷)

مسٹر ٹامسن تحریر فرماتے ہیں:

"نہ صرف سولی پر اکتفا کیا گیا بلکہ دیہات میں ان کو اپنے مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔"

(تصویر کا دوسرا رخ ص۶۳)

مسٹر ٹامسن قتل و غارت کے مظالم کا اندازہ لگانے کے لئے واقعات ذیل نقل فرماتے ہیں:

پہلا واقعہ ۳۱۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو گورنر جنرل باجلاس کونسل کی طرف سے ہندوستان میں مفصل ہدایات جاری کی گئیں کہ غیر معین طریق سے دیہات کو آگ لگانا فی الفور بند کر دیا جائے اور مجسٹریٹوں کو حکم دیا گیا کہ وہ غیر مسلح آدمیوں کو فوج کے بھاگے ہوئے سپاہی سمجھ کر ہرگز کوئی سزا نہ دیں۔

بہت سی ایسی عدالتوں سے موت اور عمر قید کے اختیارات واپس لے لئے گئے۔ کیونکہ اُن کا استعمال نہایت بے دردی سے کیا گیا تھا۔

(تصویر کا دوسرا رُخ ص ۶۵)

دوسرا واقعہ ۲۸۔ اگست کو مسٹر جان گرانٹ کو وسط ہند کا گورنر اس لئے مقرر کیا گیا تاکہ الہ آباد اور دوسرے مقامات پر بے تحاشہ پھانسیوں کے سلسلے کو بند کر دیں۔ باوجود اس امر کے کہ ایک کثیر طبقے کی طرف سے وائسرائے اور مسٹر گرانٹ کی شدید مخالفت کی گئی۔ یہاں تک کہ تعریض کے طور پر پھانسیوں کو رو کنے والا گرانٹ اور رحم دل کیننگ وغیرہ نام دے کر اُن کی ہنسی بھی اُڑائی گئی۔ پھر بھی اس مخالفت کی کوئی پروا نہ کی گئی۔

تیسرا واقعہ جب اگست میں انگریزی فوج ہندوستانی دیہات جلانے کی مہم سے واپس آ رہی تھی تو راستے میں انھوں نے وفادار سپاہیوں کی ایک جماعت کو بلاوجہ گولیوں اور سنگینوں کا نشانہ بنا دیا۔ چنانچہ انتقام کے اس خوفناک مظاہرہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ٹائمز آف انڈیا

نے اس واقعے کو جنگی یا وحشی انصاف سے تعبیر کیا۔ لیکن جنرل آڈیٹرکیم کی رائے میں یہ واقعہ معصوم انسانوں کا سنگ دلانہ قتل تھا۔"

(تصویر کا دوسرا رخ ص۴۴)

مسٹر ٹامسن نیل صاحب کا ایک آرڈر جو ٹامسن صاحب کے الفاظ میں ایک وحشیانہ آرڈر ہے نقل فرماتے ہیں کہ میجر رینارڈ جنرل نیل کی طرف سے ہدایت موصول ہوئی جب کہ وہ کانپور کے محصورین کی امداد کے لئے آرہا تھا۔" بعض دیہات کو اُن کی مجرمانہ حرکات کی بنا پر عام تباہی کے لئے منتخب کر دیا گیا ہے جہاں کی تمام مرد آبادی کو قتل کر دینا ہو گا۔ باغی رجمنٹوں کے تمام ایسے سپاہی فی الفور پھانسی پر لٹکا دیئے جائیں جو اپنے چال چلن کے متعلق اطمینان بخش ثبوت بہم نہ پہنچا سکیں۔ قصبہ فتح پور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لے کر تہ تیغ کر دیا جائے۔ باغیوں کے تمام سرغنوں کو فی الفور پھانسی پر لٹکا دیا جائے اگر وہاں کا ڈپٹی کلکٹر قابو میں آجائے تو اس کو وہیں پھانسی دے دی جائے اور اس کا سر کاٹ کر سب سے بڑی عمارت پر لٹکا دیا جائے۔"

(تصویر کا دوسرا رُخ ص۴۶)

ٹامسن صاحب ایک انگریز افسر کی ایک تحریر کا اقتباس نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

مسٹر رسل ایک طویل تحریر میں لکھتا ہے: "لیکن یہ تو انسانیت اور انصاف کے خلاف ہے کہ تمام اضلاع ہی کو تاخت و تاراج کیا جائے محض اس جرم پر کہ باغیوں نے ان علاقوں میں پڑاؤ کیا تھا۔ (تصویر کا دوسرا رخ ص۵۱)

ٹامسن صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

"کچھ افسروں کی جانب سے احتجاج کیا گیا کہ اگر اسی طرح دیہات کو جلایا جاتا رہے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ فوج کو راستے میں رسد اور چارہ بالکل دستیاب نہ ہو سکے گا۔"
(تصویر کا دوسرا رُخ صلا٦٠)

ٹامسن صاحب کا بیان ہے کہ:

"شمال مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب میں اندھا دھند پھانسیاں دی گئیں۔ ان میں مرد، عورت اور بچوں کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ نیز بے شمار دیہات جلانے کی وجہ سے آبادی کے اس حصے میں بھی نفرت اور دہشت پھیل گئی جو گورنمنٹ کے خلاف نہ تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فصلیں تباہ ہو گئیں۔ اسی قسم کی وجوہات کی بنا پر یہ افواہ نہایت ترقی پکڑ گئی کہ گورنمنٹ کا منشا تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو بیدریغ قتل کرنے کا ہے۔"

(تصویر کا دوسرا رخ صلا٦٧)

ٹامس صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"انگریزوں نے راستے میں سینکڑوں میل تک سڑک کے دونوں طرف دیہاتیوں کو بیدریغ قتل و غارت اور برباد کر کے ملک کو صحرا کی طرح ویران اور سنسان کر دیا۔ دہلی سے باغیوں کے فرار ہو جانے کے بعد انگریز فاتحین نے باشندوں کا قتل عام کیا۔ اور بے ضابطہ انگریزی عدالتوں کے حکم سے ہزاروں شہری پھانسی کے تختے پر لٹکا دیئے گئے۔ حالانکہ ان کو بغاوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ (تصویر کا دوسرا رُخ صلا٦٥)

ٹامسن صاحب خلاصے کے طور پر فرماتے ہیں:

"مختصر یہ کہ بیشمار دیہات کو ایسے وقت میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا جب کہ عورتیں، بوڑھے اور بچے گھروں کے اندر موجود تھے۔"

(تصویر کا دوسرا رُخ ص۶۷)

دہلی میں مسلمانوں کے قتلِ عام کی منادی کی گئی۔ حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے متعلق ہمیں علم تھا کہ وہ ہماری فتح کے خواہشمند تھے۔ ہمارے اکثر نوجوان تو محض خون گرانے کی خواہش پوری کرنے کے لئے اپنی ہی فوج کے ہندوستانی اردلیوں اور پوربی گھسیاروں وغیرہ کو گولی سے اُڑا دینے کی تمنا کا علانیہ طور پر اظہار کر چکے تھے۔

(تصویر کا دوسرا رُخ ص۶۸)

مسٹر ٹامسن اس کے بعد فرماتے ہیں:

"کانپور کے حادثے سے بہت عرصہ پیشتر ایک طرف تو فوجی قانون کے نفاذ کا اعلان کیا گیا اور دوسری طرف مجلس وضع قانون نے مئی اور جون میں نہایت خوفناک قوانین پاس کئے جن پر پوری سرگرمی سے عمل کیا گیا اور فوجیوں اور سول افسروں نے خونی عدالتیں قائم کر کے ہندوستانیوں کو بیدریغ موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ بلکہ بعض حالات میں تو بغیر کسی نام نہاد عدالت کے حکم کے پھانسیاں دے دی گئیں جن میں مرد و عورت کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ بایں ہمہ خوں ریزی کی آگ دن بدن اور بھڑکتی گئی۔ چنانچہ آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام

یادداشتیں محفوظ ہیں۔ جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا گیا نہ صرف سولی پر ہی اکتفا کیا گیا بلکہ دیہات میں اُن کو اپنے مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ اور شاذ و نادر ہی کسی کو گولی سے مارنے کی تکلیف گوارا کی گئی ہو۔ انگریزوں نے فخریہ لکھا ہے کہ ہم نے حتی الامکان کسی ذی روح کو زندہ نہیں رہنے دیا۔"

(تصویر کا دوسرا رُخ صہ ۶۸)

مسٹر ٹامسن تفصیل سے لکھتے ہیں کہ:

"لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا۔ چنانچہ ہر ہندوستانی کو قطع نظر اس سے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی بے دریغ تہ تیغ کیا گیا۔ یہاں تک کہ نہ تو کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ ہی اس قسم کا کوئی تکلف روا رکھا جاتا تھا۔ بلکہ محض سیاہ رنگت ہی اس کے مجرم ہونے کے لئے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ اور ہلاکت کے لئے ایک رسّا اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یا اگر یہ اشیاء مہیا نہ ہوں تو ایک بندوق کی گولی بے گناہ انسان کے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا تھا۔"

(تصویر کا دوسرا رُخ صہ ۶۹)

ٹامسن صاحب بے تحاشا برطانوی مظالم کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"دہلی میں ہماری فوج کے شہر میں داخل ہونے پر تمام ایسے لوگ جو چلتے پھرتے نظر آئے وہ سنگینوں سے وہیں ختم کر دیئے گئے۔ ایسے بدقسمت انسانوں

کی تعداد بہت کافی تھی۔ آپ اس ایک واقعے سے کافی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک گھر میں چالیس یا پچاس ایسے اشخاص ہمارے خوف سے پناہ گزیں ہو گئے جو اگرچہ باغی نہ تھے بلکہ غریب شہری تھے۔ اور ہمارے عفو و کرم پہ تکیہ لگائے ہوئے تھے جس کے متعلق میں خوشی سے ظاہر کرتا ہوں کہ وہ سخت مایوس ہوئے کیونکہ ہم نے اسی جگہ اُن کو اپنی سنگینوں سے ڈھیر کر دیا۔"

(تصویر کا دوسرا رُخ صـ۶۸)

ٹامسن صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں:

"بے گناہ شہریوں کو دیکھا کہ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ بلکہ عمر رسیدہ انسانوں کو جن کے جسم رعشہ سے کانپ رہے تھے کاٹ کر رکھ دیا گیا۔"

(تصویر کا دوسرا رُخ صـ۶۸)

ٹامسن صاحب ایک اخبار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

ٹائمز کے نامہ نگار نے لکھا تھا: "میں نے دہلی کے بازاروں میں سیر کرنا مطلقاً چھوڑ دیا ہے کیونکہ کل ایسا دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یعنی جب ایک افسر بیس سپاہی لے کر شہر کی گشت کو جانے لگا تو میں بھی اُن کے ہمراہ ہو لیا۔ اور راستے میں ہم نے چودہ عورتوں کی لاشوں کو شالوں میں لپیٹے ہوئے بازار میں پڑا پایا جن کے سر دھڑوں سے اُن کے خاوندوں نے خود جدا کئے تھے چنانچہ ایک عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دردناک حادثہ اس لئے ظہور پذیر ہوا

کہ اُن کے خاوندوں کو شبہ تھا کہ اگر انگریز سپاہیوں کے قبضہ میں آگئیں تو وہ ان کی عصمت دری کریں گے۔ لہٰذا تحفظ ناموس کا یہی طریقہ مناسب خیال کیا گیا۔ جس کے بعد خاوندوں نے بھی خودکشی کر لی۔ چنانچہ ان کی لاشوں کو بھی ہم نے دیکھا۔

(تصویر کا دوسرا رخ ص۔۔)

ایڈورڈ ٹامسن لکھتا ہے :

"فوجی شرابیوں کی دکانیں لوٹتے اور شراب پی کر بازاروں میں گشت کرتے بیدریغ قتل و غارت کرتے۔ کبھی کبھی کوئی من چلا ان میں سے کسی کو ختم کر دیتا۔ لطف یہ ہے کہ اس قاتل کو مذہبی دلیوانہ کہا جاتا ہے۔ یعنی عقل کا تقاضا یہ تھا کہ نہایت خاموشی سے ان شرابیوں کے سامنے ذبح کے لئے گردن کیوں نہ جھکا دی۔"

(تصویر کا دوسرا رخ ص۔۔)

مسٹر ٹامسن نہایت درد سے لکھتے ہیں :

"باغیوں کے جرم کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ سنگین پاداش دہلی کے باشندوں کو برداشت کرنی پڑی۔ ہزارہا مرد و عورت اور بچوں کو بےگناہ خانماں برباد ہو کر جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھاننی پڑی اور جتنا مال و اسباب وہ پیچھے چھوڑ گئے اس سے ہمیشہ کے لئے ان کو ہاتھ دھونا پڑے۔ کیونکہ سپاہیوں نے گھروں کے کونے کونے کھود کر تمام قیمتی اشیاء کو قبضے میں کر لیا اور باقی سامان توڑ پھوڑ کر خراب کر دیا۔ جس کو وہ اٹھا کر نہیں لے جا سکتے

تھے۔ (تصویر کا دوسرا رخ)۔

ٹامسن ایک انگریز مؤرخ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اسپر وال پول لکھتا ہے: وحشی نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ نہیں مچائی تھی جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے جائز رکھی۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے اور پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دی جاتی تھی۔ وال پول کا بیان ہے کہ تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی جن میں سے انتیس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلف تبصرۃ التواریخ لکھتا ہے کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کئے گئے۔ اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔ (تصویر کا دوسرا رخ ص۴۸)

شاہی خاندان کے متعلق مسٹر ٹامسن کا بیان ہے کہ:

"صفر ۱۲۷۴ھ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو بادشاہ کے سمدھی (الہی بخش) کی جاسوسی سے مسٹر ہڈسن نے تین شہزادوں مرزا مغل، مرزا حضرت سلطان اور مرزا ابوبکر وغیرہ کو ہمایوں کے مقبرہ سے گرفتار کیا اور تینوں کا سر قلم کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے ہنس کر فرمایا۔ تیموری خاندان کے بہادر فرزند اسی طرح سرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتے ہیں"۔

(تصویر کا دوسرا رُخ ص۴۳)

یہ سب حوالہ جات مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی کتاب مترجم حسام الدین بی۔اے مسمیٰ بہ "انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ" سے منقول ہیں۔ ان کے پیش کرنے سے مقصد یہ ہے کہ اس دور کے برطانوی مظالم کا اندازہ لگایا جاسکے

جیسے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس تحریک کے بانی مبانی علماء کرام تھے اور تحریک کے ذمہ دار بھی مسلمان ہی تھے۔ چنانچہ سر ولیم میور لیفٹننٹ گورنر نے لکھا ہے:

لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ مسلمانوں کو بے جان اور ضعیف خیال کرتے ہیں۔ شاید ایسا ہو مگر بہت سے شکاریوں کو خطرہ برداشت کرنے کے بعد یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ اگر کسی عالی نسب شیر پہ زخم لگایا جائے گا تو وہ کیسا ہی ضعیف اور ناتواں بلکہ قریب المرگ ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اپنی اصلی حرارت کے ساتھ ایک مرتبہ جست لگا کر چاروں طرف ہلاکت اور تہلکہ مچا دے گا۔ یہ تحریر ۱۸۶۷ء میں سر ولیم نے تحریک ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھی تھی۔ اس سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ انگریز کی نگاہوں میں تحریک کے اصلی مجرم مسلمان تھے خصوصاً علماء۔ ظاہر بات ہے کہ مظالم کا نشانہ بھی سب سے زیادہ انہی لوگوں کو بنایا گیا۔ چنانچہ مولانا احمد اللہ شاہ صاحب دلاور جنگ مدراسی جنہوں نے لکھنؤ میں حکومت قائم کی تھی ان کو ایک مہاراجا کے ذریعے قتل کرایا گیا۔ اور ان کا سر نیزے پہ اٹھا کر اس کا ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں مظاہرہ کرایا گیا۔ اور مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کو جو کہ تحریک کے بہت بڑے رکن تھے اور بریلی، علی گڑھ اور اس کے ملحقہ اضلاع کے دوران تحریک میں گورنر تھے آخر اُن کو گھر سے گرفتار کیا گیا اور لکھنؤ میں اُن کی سزا کے لئے ایک جیوری بیٹھی جس مخبر نے ان کو گرفتار کرایا تھا اس نے انکار کر دیا کہ مجھے معلوم نہیں فتویٰ جہاد پر جس نے دستخط کئے

ہیں وہ یہ فضل حق ہیں یا کوئی اور ہیں۔ اُس نے پہچاننے سے انکار کردیا۔ اور مولانا خود اپنی طرف سے وکیل تھے۔ انھوں نے سب الزامات کو ایک ایک کر کے رد بھی کر دیا۔ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ مولانا کل رہا ہو جائیں گے۔ دوسرے دن عدالت فیصلے کے لئے بیٹھی تو مولانا نے فرمایا کہ مخبر نے پہلے جو رپورٹ لکھوائی تھی وہ بالکل صحیح تھی کہ فتویٰ میرا ہے۔ اب میری شکل وصورت سے مرعوب ہو کر یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یقیناً یہ فتویٰ میرا لکھا ہوا ہے۔ اور اس پر میرے دستخط ہیں۔ قربان جائیے علامہ کی شانِ استقلال پر خدا کا شیر گرج کر کہہ رہا ہے کہ: میرا اب بھی یہی فیصلہ ہے کہ انگریز غاصب ہے اور اس کے خلاف جہاد لڑنا فرض ہے۔" خدا کے بندے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ جان کی پروا کئے بغیر سر بکف ہو کر میدان میں نکلتے ہیں اور پھر لومڑی کی طرح ہیر پھیر کر کے جان نہیں بچایا کرتے بلکہ شیروں کی طرح جان دینے کو فخر سمجھتے ہیں۔

چنانچہ جیوری مجبور ہو گئی اور مجبوراً دریائے شور کی سزا کا حکم سنایا اور آپ کو کالے پانی بھیج دیا۔ ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ میں آپ کا وہاں ہی انتقال ہو گیا۔ اور ان کو وہاں ہی دفن کر دیا گیا۔ باقی مولانا فیض احمد صاحب بدایونی، مولوی عبدالقادر دہلوی، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولوی وزیر خاں اکبر آبادی۔ سید مبارک شاہ رامپوری اور مولوی ولایت علی شاہ الہ آبادی ان سب کو پھانسی کا حکم ہوا اور پھانسی پر لٹک کر جاں بحق ہو گئے۔

جیسے اڈورڈ ٹامسن نے شہادت دی ہے کہ صرف دہلی شہر میں پانچسو علماء

کو پھانسی لگائی گئی۔ اس سے آپ خود اندازہ لگائیں کہ تمام ملک میں کس قدر علماء پر ظلم وستم ہوا، اور کتنوں نے آزادیٔ وطن کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب کے ساتھی مولانا حافظ رمضان صاحب بھی اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ صرف حاجی امداد اللہ صاحب اور شاہ عبد الغنی صاحب نامعلوم طریقے سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہنچ گئے اور آخر تک وہیں رہے۔ صدر الصدور مولانا صدر الدین صاحب آزردہ نے فتوے پر لکھ دیا تھا۔ شہادت بالجر۔ لوگوں نے اس حرم کا مطلب آزادی سمجھا۔ بعض نے کہا کہ یہ بالخیر ہے۔ جب مفتی صاحب پر مقدمہ چلا تو انھوں نے کہا کہ یہ بالجبر تھا صرف نقطے رہ گئے تھے۔ اس تاویل سے جان تو بچ گئی مگر جائداد ساری ضبط ہو گئی۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے مگر آپ روپوش ہو گئے۔ اور بعض سفارشوں کی وجہ سے وارنٹ گرفتاری واپس ہو گئے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی چھ مہینے گرفتار رہ کر آخر رہا ہو گئے۔ چونکہ اس وقت ان کی اتنی شہرت نہ تھی، آپ دونوں نوجوان علماء میں شمار ہوتے تھے اس لئے ان دونوں پر چنداں سختی نہیں کی گئی ورنہ تحریک میں دونوں نے پورا پورا حصہ لیا تھا۔ چنانچہ ضلع مظفر نگر اور سہارنپور کے امیر حاجی امداد اللہ صاحب تھے اور قاضی القضاۃ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی۔ اور سپہ سالار مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی تھے۔ ان حضرات نے تھانہ بھون اور اس کے مضافات پر قبضہ کرنے کے بعد شاملی پر قبضہ

کر لیا تھا جو کہ انگریزی فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اندریں حالات ان دونوں حضرات کا بچنا مشکل تھا مگر مذکورہ بالا وجہ اور خدا کی غیبی امداد سے دونوں بال بال بچ گئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ان سے ایک بہت بڑا کام لینا تھا۔

اس کے بعد ۱۸۵۸ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی حکومت کمپنی سے چھین کر اپنے قبضے میں کر لی۔ اور ملکہ وکٹوریہ کا وہ خاص اعلان کیا گیا جس میں دو باتوں پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا۔

(۱) ہندوستانی رعایا پر اب سختی نہ کی جائے گی بجز مجرموں کے۔

(۲) توسیع مملکت کے لئے نہ اندرون ملک میں اور نہ بیرون ملک میں کہیں بھی فوج کشی نہ کی جائے گی۔ لیکن اس کے بعد انگریز ڈپلومیسی نے وہی کچھ کیا جو ہمیشہ کرتی رہی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی سرحدوں کو بڑھانے اور توسیع مملکت کے لئے مندرجہ ذیل مہمیں بھیجی گئیں۔ جانی نقصان کے علاوہ ان کا مالی خرچہ بھی ہندوستان پر ڈالا گیا۔ نقشہ ملاحظہ فرمائیے:

۱۸۵۸ء	دوار آف بھوٹان پر قبضہ کیا گیا۔
۱۸۵۸ء	برما کا شمالی حصہ فتح کر کے سلطنت میں شامل کیا گیا۔
۱۸۹۰ء	ریاست منی پور کو حکومت میں شامل کیا گیا۔
۱۸۹۵ء	ریاست چترال کو فتح کیا گیا۔
۱۸۹۶ء	تیراہ پر حملہ کیا گیا۔
۱۸۸۷ء	کابل پر حملہ کیا گیا جس میں ۴۰ لاکھ پونڈ خرچ ہوا۔

سنہ ۱۸۹۷ء سرحدی مجاہدین پر حملہ کیا گیا جسمیں ۴۲ لاکھ پونڈ خرچ ہوا۔
سنہ ۱۸۹۸ء تبت اور چین پر حملہ کیا گیا جسمیں ایک لاکھ ۲۰ ہزار پونڈ خرچ ہوا۔
سنہ ۱۸۶۸ء مجاہدین سرحد کے خلاف یکے بعد دیگرے چھ مہمیں بھیجی گئیں جن میں لاکھوں پونڈ خرچ ہوا۔

ان لڑائیوں میں ہزاروں کی تعداد میں ہندوستانی نوجوان کام آئے اور کروڑوں روپئے کا قرضہ ہندوستان کے قومی خزانہ پر ڈال دیا گیا اور ہمارے قرب وجوار کے قبائل اور ممالک ہندوستانیوں کے دشمن بن گئے یہ تو تھا اندرونِ ہند کا معاملہ لیکن حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان سے باہر بھی جہاں کہیں لڑائی لڑی اس کا جانی اور مالی نقصان ہندوستان ہی کو برداشت کرنا پڑا۔

ہندوستان کے لئے بحری راستے کی حفاظت حکومتِ برطانیہ کی نگاہوں میں اشد ضروری تھی۔ چنانچہ اس نے ان کے لئے حسب ذیل تدبیریں کیں

سنہ ۱۸۲۹ء میں سلطان عبدالمجید خاں محمد علی پاشا کی بغاوت کو دباتے کے لئے انگریز نے امداد کی۔ ہندوستان کے ذمے بیس لاکھ پونڈ قرضہ ڈالا گیا اور سلطان سے عدن کی بندرگاہ اپنے نام لکھالی۔ اس کے بعد پورے صوبہ عدن پر قبضہ جمالیا اور آج تک قبضہ ہے۔

سنہ ۱۸۶۹ء میں اسماعیل پاشا خدیو مصر نے بعض فرانسیسی کمپنیوں کی مدد سے نہر سویز کھدوائی۔ انگریز نے اسماعیل پاشا سے خفیہ معاہدہ کر کے تمام حصے انتالیس لاکھ چھتر ہزار پانچسو بیاسی پونڈ میں خرید لئے۔ اب نہر پر

انگریز کا پورا قبضہ ہوگیا۔

سنہ ۱۸۸۲ء میں اسماعیل پاشا کی خودداری سے انگریز نے ناراض ہوکر اسکندریہ پر بمباری شروع کردی۔ دو سال کے متواتر کشت وخون کے بعد باب علی سلطان عبدالمجید خاں پر دباؤ ڈال کر اسماعیل پاشا کو معزول کرادیا اور اس کی جگہ توفیق پاشا کو خدیو مصر مقرر کرادیا۔ توفیق پاشا کی حکومت انگریزوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھی۔ اسی دور میں سر آویلین بیرنگ (جو بعد میں لارڈ کرومر کے نام سے مشہور ہوا) مصر میں وارد ہوا۔ اور تمام مصر وسوڈان جنرل کونسل بن گیا۔ اور تمام مصر وسوڈان کو حکومت برطانیہ کا ایک صوبہ بنادیا گیا۔ اس لڑائی کا خرچہ جانی نقصان کے علاوہ ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ ہندوستانی قرضے میں ڈال دیا گیا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں ممالک افریقہ کی مختلف ریاستوں پر انگریز نے حملہ کیا اور انکو اپنے قبضے میں کرلیا، جانی نقصان کے علاوہ ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ پونڈ ہندوستانی قرضے میں ڈال دیا گیا۔ یہی قرضے ہندوستان کے قومی خزانے پر سود کے اضافے سے بڑھتے گئے چنانچہ سنہ ۱۹۱۲ء میں ۱۲ ارب ۱۴ کروڑ کی مقدار ہوگئی اور آگے دن بدن اسکی مقدار بڑھتی ہی گئی اور انگریز ہندوستان سے اس کا سود وصول کرتا رہا جس کی تفصیل ہم آگے چل کر معاشیاتی بحث میں کریں گے۔

سنہ ۱۸۷۸ء میں باب علی سلطان عبدالمجید خاں سے ایک خفیہ معاہدہ کے ذریعے جزیرۂ قبرص کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ اس کے بعد اسی سال جبرالٹر پر حملہ کر کے انگریز نے اس کو بھی اپنے قبضے میں کرلیا۔ بعدہٗ مالٹا پر حملہ کیا اور اس کو بھی اپنے تصرف میں لائے۔ مالٹا بحیرۂ روم کے مرکز میں واقع ہے اور قبرص مشرق میں، جبرالٹر مغرب میں۔ ان کے لڑائی کے

اخراجات اور حفاظت کے بھی ہندوستان کے قومی قرضے میں ڈال دیئے گئے کیونکہ یہ ہندوستان کے راستے میں واقع ہے۔ یہ تو تفصیل تھی ہندوستان اور انگلستان کے راستے کی۔

ترکی حکومت کے خلاف برطانیہ نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل کے لئے مجلّدات درکار ہیں۔ ہم یہاں صرف اشارات پر اکتفا کریں گے۔ نقشہ ذیل ملاحظہ ہو:

۱۸۵۸ء میں مولڈیویا اور ولاچیا کی عیسائی رعایا سے بغاوت کرا کے الیگزنڈر کوزا کو دولِ عظمیٰ نے اپنی حمایت میں ان ریاستوں کا امیر منتخب کر دیا۔

۱۸۵۸ء میں کریٹ، سرویا، مونٹی نیگرو، بوسینیا، ہرضی گوینا، بلغاریہ میں شورشیں برپا کرائیں۔ ان میں پہلے نیم آزاد حکومتیں قائم کرائیں اور پھر ۱۸۶۶ء میں دولِ یورپ نے ان کو بالکل آزاد کرا دیا۔

۱۸۶۸ء میں ولاچیا، مولڈیویا کے لوگوں نے مل کر رومانیہ میں بغاوت کرائی۔ اور دولِ عظمیٰ نے بابِ علی پر زور ڈال کر رومانیہ کو آزاد کرا دیا۔ جرمنی کے شہزادہ چارلس کو اس کا فرمانروا مقرر کر دیا گیا۔

۱۸۷۵ء میں زارِ روس نے بین الاقوامی معاہدات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بحرِ اسود میں اپنا بحری بیڑہ بھیج دیا۔ اور ترکی کے بعض ساحلی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

۱۸۷۶ء میں دولِ یورپ کی انگیخت اور سازشوں سے بلقان میں

شورش برپا ہوئی اور دولِ یورپ نے مداخلت کر کے بابِ علی سے باغیوں کے مطالبات منوائے اور وقتی طور پر بغاوت دب گئی۔

سنہ ۱۸۷۷ء میں روس نے بلقان پر حملہ کر دیا اور دولِ یورپ سے غیر جانب دار رہنے کا خفیہ معاہدہ لے لیا۔ لڑائی کئی ماہ تک زوروں پر رہی۔ آخر ٹرکی کو شکست ہوئی اور زار روس نے ایڈریا نوپل کو فتح کر لیا۔ ۱۸۷۸ء میں دولِ یورپ کی مداخلت سے پھر صلح ہو گئی۔

سنہ ۱۸۷۸ء میں برلن میں دولِ عظمیٰ کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس سے بابِ علی کے نمائندوں کو معلوم ہوا کہ دولِ یورپ نے سلطنت ٹرکی کے حصّے بخرے خفیہ طور پر بانٹ لئے ہیں جس کے نتیجے میں ٹرکی کے نوجوان فوجیوں میں برہمی پیدا ہوئی۔ چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا۔

سنہ ۱۸۳۰ء میں فرانسیسی فوجیوں نے الجزائر پر حملہ کر کے اُسے اپنے قبضے میں کر لیا جو ٹرکی حکومت کا ایک صوبہ تھا۔

سنہ ۱۸۸۱ء میں فرانسیسی فوجوں نے تیونس پر حملہ کر کے اس کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں دولِ عظمیٰ نے ٹرکی کے خفیہ طور پر جو حصّے بخرے کئے تھے اُن کی رُو سے فرانس کو اجازت دی گئی کہ وہ مراقش پر بھی اپنا قبضہ کرے، آخر اس نے مراقش پر بھی قبضہ جمالیا۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں ایران کی تقسیم کی گئی۔ شمالی ایران روس کو ملا اور جنوبی پر انگریز نے اپنا تسلط کر لیا۔

۱۹۱۸ء میں بلغاریہ، سرویا اور یونان نے مل کر مقدونیا میں بغاوت پھیلائی۔ اور آخر باہمی جدال و قتال کے بعد اس کو ترکی حکومت سے چھین کر آپس میں تقسیم کر لیا۔

۱۹۱۰ء میں اٹلی نے طرابلس (لیبیا) کے صوبے پر حملہ کیا۔ بڑے کشت و خون کے بعد دول عظمیٰ نے مداخلت کر کے اٹلی کو دلوا دیا۔

۱۹۱۲ء میں سرویا اور مونٹی نیگرو، یونان اور بلغاریہ نے روس کے اشارے پر مل کر بلقان پر حملہ کر دیا۔ یہی وہ جنگ بلقان ہے جس میں ہندوستان کی آزاد تحریکوں نے مالی اور اخلاقی مدد کی ورنہ اس سے پہلے ہندوستان کسی سیاسی تحریک میں کھل کر حصہ لینے کے قابل نہ تھا۔ یہ تو مسلمانوں کی مرکزی طاقت حکومتِ ترکی کے خلاف دولِ یورپ کی چیرہ دستیوں کا بیان تھا لیکن ہندوستان اور اس کے ملحقہ علاقوں میں برطانوی مکروفریب نے کیا کیا گل کھلائے اُس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اسی دوران ۱۹۰۸ء میں ترکی میں فوجی انقلاب رونما ہوا۔ انور پاشا کی قیادت میں فوجیوں نے ایک تنظیم بنائی جس کا نام اتحاد المسلمین تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں ملوکانہ اور شاہانہ نظام کی وجہ سے جو بد دلی پھیلی ہوئی ہے اُس کی جگہ جمہوری نظام قائم کر کے اس بد دلی کو دور کر دیا جائے اور مسلمانوں کا خلیفہ جو دولِ یورپ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہے اور پرلے درجے کا کمزور اور بزدل ہے اس کے اختیارات کو محدود کر دیا جائے۔ چنانچہ اس انجمن نے ۱۹۰۸ء میں اپنے اصلاحی پروگرام کا اعلان کیا۔ دیکھتے دیکھتے

چند دنوں میں اس پارٹی نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اور بادشاہ کے اختیارات کو محدود کر کے نظامِ حکومت اپنے قبضے میں لے لیا۔ اب دول یورپ کے لئے اپنی ریشہ دوانیوں کے سب راستے مسدود ہو گئے اور وہ منتظر تھیں کہ کوئی موقع ملے تو جبر و تشدد کے بل بوتے پر اس تحریک کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جنگِ عظیم اوّل کے وقت اُن کو یہ موقع ہاتھ آیا اور انھوں نے اس تحریک کو سرزمین ترکی تک محدود کر دیا جس کی تفصیل ہماری آئندہ بحث کا موضوع ہے۔ اب ہم انگریز کے سیاسی مظالم کی داستان یہاں ہی ختم کر کے دوسری بحث کو شروع کرنا چاہتے ہیں یعنی اخلاقی ابتری و تنزل اور اس کے بعد معاشیاتی مظالم اور لوٹ کھسوٹ کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں

اس مذکورہ بالا حصّے کا نام ہم نے مظالمِ سیاسیہ رکھا ہے جس کے اجمالی اشارات یہاں تک ذکر کئے گئے ہیں۔ اب دوسرے حصّے کا نام ہم مثالب اخلاقیہ رکھتے ہیں۔ مثالب کے معنی عربی لغت میں اخلاقی کمتری و گراوٹ کے ہیں۔ یعنی اخلاقی تنزل اور بد اخلاقی و غیر مہذب حرکات کا ظہور و غلبہ۔ چونکہ یہاں بھی ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہ بتلایا جائے کہ انگریز سے پہلے ہندوستانی کن بلند اخلاق کے مالک تھے۔ اور انگریز نے کس طرح ان کو ختم کر کے اُن کی جگہ ہندوستانیوں میں بد اخلاقی پھیلائی اور اخلاقی لحاظ سے ان کو اقوامِ عالم میں بدنام کیا۔ اور اخلاقی قدروں کو نیست و نابود کر کے اس لحاظ سے ہندوستانیوں کا دیوالیہ پن روزِ روشن

کی طرح ظاہر و باہر کر دیا۔ ہم نے اس حصے میں صرف انگریزی حوالوں پر اکتفا کی ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو لوگ سمجھتے کہ اخلاق تو انسان کے خلقی و فطری ملکات کے تابع ہوتے ہیں اُن کو انگریز نے کیسے تباہ و برباد کیا لہٰذا ہم نے انگریز کے حوالوں سے پہلے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی انگریزی اقتدار سے پہلے بلند اخلاق کے مالک تھے اور پھر اس کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ انگریز نے کس طرح ہندوستانیوں کے اخلاق بگاڑے!

تیسرے حصے کا نام ہم نے مسالب معاشیہ رکھا ہے کیونکہ مسالب کے معنے لوٹ کھسوٹ کے ہیں اور یہاں بھی ہمارا مقصد انگریز کی لوٹ کھسوٹ کو واضح کرنا ہے اس لئے اس کا نام مسالب معاشیہ رکھا گیا ہے۔

اب اسباب کی تحریک کے تین حصے یہ ہوئے:

مظالم سیاسیہ۔ مثالب اخلاقیہ۔ مسالب معاشیہ

پہلے کا بیان ہو چکا۔ اب ہم دوسرے حصے کو شروع کرتے ہیں۔

مثالبِ اخلاقیہ کا بیان

ہم یہاں پہلے تہذیبی اور اخلاقی قدروں پر بحث کریں گے کہ ہندوستانی اقوامِ عالم میں بلند اخلاق اور کیریکٹر کے مالک تھے ان کی تہذیب و شائستگی اقوامِ عالم میں مشہور تھی اور دُنیا اُن کے اخلاق پر رشک کرتی تھی لیکن انگریز نے مختلف طریقوں سے ان کے اخلاق کو تباہ و برباد کیا اور ان کی تہذیب و اعلیٰ کیریکٹر کو نیست و نابود کر کے ان کو بد اخلاق بنا دیا۔ اور اقوامِ عالم کی نگاہوں میں اُن کو ذلیل کیا۔ آج انگریز کے ذریعے سے سرزمین پاک و ہند کے لوگ دُنیا بھر میں بد اخلاق و غیر مہذب اور بدکردار و غیر شائستہ مشہور ہیں۔ یہ سب کچھ انگریز کے ذریعے ہوا ہے۔ پھر ہم یہ ثابت کریں گے کہ انگریز سے پہلے ہندوستانی تعلیم یافتہ تھے اور علوم و فنون میں اقوامِ عالم میں اُن کو بلند مقام حاصل تھا۔ اقوامِ عالم ان سے علوم حاصل کرتی تھیں لیکن انگریز نے ان کو جاہل بنا دیا۔ اور علم ہی کی بدولت قومیں مہذّب و خوش اخلاق ہوا کرتی ہیں۔ علم حسنِ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ جس قوم میں علم ہے وہ بلند اخلاق کی مالک ہے اور جس میں علم نہیں وہ اخلاقِ حسنہ کی دولت سے تہیدست ہے کیونکہ جیسے علم اخلاقِ حسنہ کا

سرچشمہ و منبع ہے۔ ایسے ہی جہالت بداخلاقی و غیر مہذبی کا منبع و سرچشمہ ہے علم سے اخلاق و تہذیب کی بلند قدریں قائم ہوتی ہیں اور جہالت سے بداخلاقی و غیر شائستگی کی نہریں پھوٹ پڑتی ہیں۔ غرضیکہ علم روشنی ہے اور جہالت تاریکی انگریز سے پہلے ہندوستانی، مسلم اور غیر مسلم سب کے سب علوم و فنون میں یکتائے روزگار تھے لیکن انگریز نے ان کو جاہل بنایا اور علم کی دولت سے محروم کیا۔ جب علم کی روشنی کی جگہ جہالت کی تاریکی چھا گئی تو اب ہندوستانیوں سے اخلاقِ حسنہ و بلند کیریکٹر کی توقع رکھنا بے معنی ہے۔ علم کے بغیر اخلاقِ حسنہ کا حصول ایسا ہی محال ہے جیسا کہ سورج کے بغیر دن کا وجود!

لیکن اس ساری بحث میں ہم صرف انگریز مصنفین و مؤرخین کے حوالوں کا ذکر کریں گے اور اپنی جانب سے کچھ نہ کہیں گے۔ قارئین خود غور کریں اور حقیقت کی تہہ تک پہنچیں۔

مسلمان بادشاہوں کا نظامِ حکومت

اس بارہ میں سر بارٹل فریرے نے لکھا ہے :- ایک دیسی شہزادہ کا دربار بھی کونسل کے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔ ایک اچھے حکمراں کے زیر اثر اس دربار میں سب کی رسائی ہوتی ہے اور ہر ایک کو تقریر کرنے کی بڑی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی ذریعہ ہے جس سے وہ رعایا پر کسی قانون کے اثر کو محسوس کر سکتا ہے۔ اور وہ اس طرح بے چینی کو پہلے ہی معلوم کر لیتا ہے

(رپورٹ آئینی اصلاحات مانٹیگو چمیسفورڈ ص ۳۸)

آپس میں رشتہ داریاں اور بیاہ شادی جاری کر لی تھی۔ ہر قسم کے عہدے وزارتِ عظمیٰ اور سپہ سالاری سے لے کر ادنیٰ ادنیٰ انتظامی اور فوجی عہدوں تک بلا لحاظِ نسل و رنگت اور مذہب و وطنیت حسبِ قابلیت مفتوح اقوام کو بھی دیتے رہتے تھے۔ انھوں نے ہندوؤں کو مہاراجہ، راجہ اور تعلق دار بنایا۔ بڑی بڑی ریاستیں دیں۔ ہفت ہزاری، شش ہزاری، پنجہزاری اور نیچے کے تمام مناصب عطا کئے۔ سر سی۔ پی۔ رائے (مشہور بنگالی لیڈر) کہتا ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں اور بڑے بڑے زمیندار بنا دیئے گئے۔

اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا، وائسرائے بنایا۔ یہاں تک کہ اس نے خالص مسلم صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب السلطنت مقرر کیا تھا وہ ہندو راجپوت تھا۔ (روشن مستقبل ص۱۴۳)

برنیئر فرانسیسی کہتا ہے کہ رعایا کی حفاظت اس طرح کی جاتی ہے جس طرح بادشاہ اپنے خاندان کے افراد اور اہل وعیال کی کرتے ہیں۔ کسی طرح گوارا نہیں کیا جاتا کہ کوئی فوجی یا پولیس یا کوئی اجنبی کسی رعیت پر کسی ستم کی دست درازی کرے۔"

حرفتی کمیشن جس کے تمام ممبر انگریز تھے اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:

"ایسے زمانے میں جب کہ مغربی یورپ میں جو کہ موجودہ طریق حرفت کا مولد و منبع ہے غیر مہذب قبائل آباد تھے۔ ہندوستان اپنے حکمرانوں کی دولت اور اپنے کاریگروں کی اعلیٰ صنعت کے لئے مشہور تھا۔ اور بہت بعد کے وقت میں جب کہ مغرب کے حوصلہ مند تاجر پہلے پہل ہندوستان میں نمودار ہونے لگے یہ ملک زیادہ ترقی یافتہ یورپین اقوام سے کسی طرح گھٹا ہوا نہیں تھا۔"

سر تھامس منرو (برطانوی قبضے سے قبل ہندوستانی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے) کہتا ہے: ہندوستانیوں کا طریقۂ کاشت کاری، بے مثل صنعت و حرفت ان کی صنعت و کاشت کاری کے معاملے میں اعلیٰ استعداد، ہر قریہ میں ایسے مدارس کی موجودگی جس میں نوشت و خواند اور حساب کی تعلیم ہوتی ہو۔ ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ موجود ہو اور سب سے زیادہ یہ کہ

صنفِ نازک پر پورا اعتماد کیا جاتا ہو۔ اُس کی عزت، عصمت اور عفت کا پوری طرح لحاظ رکھا جاتا ہو۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم اس قوم کو غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے۔ ایسے صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یورپی اقوام سے کسی طرح کمتر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر انگلستان و ہندوستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کی جائے۔ تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔"

لارڈ ولیم بنٹنگ (مشہور وائسرائے ہند و گورنر مدراس نے) ۱۸۸۲ء میں کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا: "بہت سی باتوں میں اسلامی حکومتیں انگریزی راج سے کہیں بہتر تھیں مسلمان اس ملک میں آباد ہوگئے جسے انھوں نے فتح کیا تھا۔ وہ ہندوستانی باشندوں میں مل جل گئے ان میں بیاہ شادی کرنے لگے مسلمانوں نے ہندوستانی قوموں کو ہر قسم کے حقوق دیئے۔ فاتح اور مفتوح کے مذاق دلچسپی اور ہمدردی میں یکسانیت تھی۔ کوئی فرق نہ تھا بخلاف اس کے انگریزی پالیسی اس کے برعکس ہے۔ اب سرد مہری، خود غرضی، بے پروائی ہے جس میں ایک طرف حکومت کا آہنی پنجہ حکمراں ہے اور دوسری طرف ہر چیز پر اپنا قبضہ ہے اور ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہے۔

(ہندوستان میں عیسائیوں کی حکومت از میجر باسو جلد ۴ صفحہ ۲۲۶)

پنڈت سندرلال اپنی کتاب "بھارت میں انگریزی راج" میں فرماتے ہیں اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے

زمانے میں ہندو اور مسلمان کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی ہر بادشاہ کی طرف سے بیشمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں الخ -

برطانوی نظامِ حکومت

یہی پنڈت سندر لال اپنی مذکورہ کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

"مگر جب سے انگریزی راج شروع ہوا اُسی وقت سے ہندوستانیوں کی قومی توہین اور تذلیل اور نسلی اور وطنی امتیاز اور رنگت اور یورپین اور نیٹو (دیسی) کا ذلیل کرنے والا تفرقہ شروع ہوا جو کہ طاقت اور قوت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہوا انتہائی درجے کو پہنچ گیا۔ باوجودیکہ انگریز پردیس سے بطورِ مہمان تجارت کے لئے آتے تھے اور شہنشاہانِ ہندوستان کے رحم وکرم سے تجارت کی اجازت حاصل کر کے فرمانات شاہی کے سایہ میں روز افزوں ترقی کرتے رہے اور پھر شہنشاہانِ اسلام پر ڈورے ڈال کر دیوانی (ریونیو) کی ملازمت حاصل کر کے انتظامی امور میں دخیل ہوئے اور پھر غداریاں کرتے ہوئے تمام نظامِ سلطنت کو رفتہ رفتہ ملیامیٹ کر کے تقریباً سو برس میں سنہ ۱۷۶۵ء سے سنہ ۱۸۶۴ء تک ہندوستان کے بادشاہ بن گئے۔ سنہ ۱۷۶۵ء کے کچھ بعد ہی سے ہندوستانی افسروں کو آہستہ آہستہ خلافِ معاہدہ نکالنا شروع کیا۔ اور جن عہدوں کو کوئی انگریز قبول کر سکتا تھا اُن پر انگریزوں کو مقرر کیا۔

سر جان شور کہتا ہے: (سنہ ۱۸۳۳ء میں انگریزی قانون اور نظام پر بحث

کرتے ہوئے) "ہر وہ عہدہ اور عزّت اور منصب جس کو قبول کرنے کے لئے ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز کو آمادہ کیا جاسکتا ہے ہندوستانیوں کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔"
(حکومت خود اختیاری ص ۲۷)

سر میلکم لوئس جج عدالت عالیہ (ہائیکورٹ) مدراس و ممبر کونسل نے اپنے ایک رسالہ میں لندن سے لکھا تھا "ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا اُن کے قانونِ وراثت کو منسوخ کیا۔ بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا۔ مذہبی رسم و رواج کی توہین کی۔ عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کرلیں۔ سرکاری کاغذات میں انھیں کافر لکھا۔ امرا کی ریاستیں ضبط کرلیں۔ لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا۔ اُنھیں تکلیف دے کر مال گزاری وصول کی۔ سب اونچے خاندانوں کو برباد کر کے انھیں آوارہ بنا دینے والے بندوبست قائم کئے۔"
(رسالہ ہندوستان کی سیاسی ترقی ص ۳)

لارڈ میکالے لکھتا ہے (ماخوذ از میکالے کا مضمون ہیسٹنگز کے متعلق ص ۶۳) در بارہ قوانین کورٹ: بات بات پر حلف لئے جاتے تھے۔ در آنحالیکہ قسم کھانا آبرودار ہندوستانی کے نزدیک گناہ ہے۔ اس کے علاوہ مشرق میں کسی شریف آدمی کے زنانہ مکان میں غیر مرد کا گھس جانا یا کسی عورت کو بے پردہ دیکھ لینا ناقابلِ برداشت ظلم سمجھا جاتا ہے جس کا بدلا صرف خون سے لیا جاسکتا ہے مگر یہی مصیبتیں تھیں جن کا نشانہ بنگال اور بہار کے شریف گھرانے بنائے جارہے تھے۔ ہندی رعایا کے بدترین لوگوں کا ایک گروہ اُن کے گرد جمع ہوگیا تھا جن میں حلاف، فتنہ پرداز اور جعل ساز

سب ہی تھے۔ اور ان کے ماسوا نظارت کا وہ قزاق عملہ تھا جس کے سامنے انگریزی حوالات کے بدترین شخص بھی ایمان دار اور رحم دل معلوم ہوتے ہیں۔ ہندوستانی شرفاء جو بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے گرفتار ہو کر کلکتہ بھیجے گئے اور قید خانہ میں بند کر دیئے گئے۔ شریفوں کے زنانخانے وہ چیز ہیں کہ مشرقی سلاطین جو کسی چیز کا احترام نہیں کرتے اُن کا احترام کرتے ہیں۔ مگر اب یہی زنان خانے تھے جہاں ناظروں اور امینوں کے گروہ گھس جاتے تھے۔ ایسی مثالیں بھی دیکھی جاتی ہیں کہ حرم سرا کی حفاظت میں بعض نے لڑکر ڈیوڑھیوں پر جانیں دے دیں۔ مرہٹوں کے حملے سے صوبہ میں یہ ہلچل نہیں پیدا ہوئی تھی جو انگریزی قانون کی اس یورش سے ظہور میں آ رہی ہے۔"

(روشن مستقبل صہ ۴۳)

چنانچہ ۱۸۲۷ء میں جب جارید جیوری کا قانون نافذ ہوا تو راجہ رام موہن رائے نے اس کے خلاف ہندو مسلمانوں کی طرف سے ایک احتجاجی عرضداشت پرزور الفاظ میں پارلیمنٹ میں بھیجی۔ اس میں لکھا گیا کہ عدالتوں میں مذہبی امتیاز قائم کر دینے سے ہندوستانیوں میں سخت ناراضی ہے اس قانون کی رُو سے مہذب ترین ہندوستانی کا مقدمہ ایک دیسی عیسائی حاکم کر سکتا ہے۔ برخلاف اس کے دیسی عیسائی کا مقدمہ ایک ہندوستانی کی عدالت میں نہیں جا سکتا۔ نیز یہ کہ ہندوستانیوں کے مقدمات کے فیصل کرنے کے لئے جیوری بٹھائی جاتی ہے تو اس میں کوئی ہندوستانی اس جیوری

کا ممبر نہیں ہو سکتا۔ ان امور سے ہندوستانیوں کی انتہائی ذلت اور خواری ہو رہی ہے۔" (سوانح راجہ رام موہن رائے از نیٹسن (انگریزی ص۴۵)

سر تھامس منرو اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:

وضع قانون میں ان کا (ہندوستانیوں کا) کوئی حصہ نہیں اور قوانین کے عملدر آمد میں ان کو بہت کم دخل ہے۔ باستثنا چند نہایت چھوٹے عہدوں کے وہ کسی بڑے عہدے تک خواہ وہ فوجی ہو یا سول نہیں پہنچتے۔ وہ ہر جگہ ایک ادنیٰ قوم کے فرد سمجھے جاتے ہیں۔ تمام فوجی اور دیوانی وہ عہدے جو کچھ بھی اہمیت رکھ سکتے ہیں اب یورپینوں کے قبضے میں ہیں جن کا پس انداز روپیہ خود اُن کے ملک کو چلا جاتا ہے۔"

(دت ص۱۴۴ جلد دوم)

سر سید نے اسباب بغاوت ہند میں لکھا ہے:

"بے عزتی ایسی بد چیز ہے کہ اس سے دل پر زخم ہو جاتا ہے جو اچھا نہیں ہوتا، گورنمنٹ نے ہندوستانیوں کو نہایت بے وقار کر دیا۔ صاحب کا پیش کار صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا چلا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے۔ دراصل انگریز اور ہندوستان مثل آگ اور سوکھی گھاس کے ہیں یا مثل پتھر کے دو ٹکڑوں کے ہیں سفید اور کالے جن میں فاصلہ دن بہ دن زیادہ ہوتا جاتا ہے اور یوں تصور کیا جاتا ہے کہ گویا ہندوستان میں کوئی جنٹلمین نہیں ہے۔" (روشن مستقبل ص۸۸)

مسٹر ہولٹ مکنزی سنہ ۱۸۳۰ء میں لکھتا ہے (مال اور دیوانی کی یادداشتوں میں ذکر کرتے ہوئے) "یہ عمل نہایت حیرت انگیز ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ ایسے نیک دل انگریزوں کا برتاؤ بھی حقارت آمیز رہا ہے جو فی الواقع نیک نیت تھے"۔

(حکومت خود اختیاری ص۱۸)

مسٹر لڈلو اپنی کتاب برٹش انڈیا میں لکھتا ہے:

انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کے فتح ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بجائے ابھرنے کے اس کے تمام باشندے ذلیل ترین ہو جائیں گے"۔

(حکومت خود اختیاری ص۱۹)

سر تھامس رو جو کہ شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں آیا تھا ہندوستانیوں کی تہذیب اور تمدن کو دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ اسی بنا پر وہ اپنے مقالے میں جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں ہندوستانیوں کے اوصاف کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے "ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ موجود ہو اور سب سے زیادہ یہ کہ صنفِ نازک پر پورا اعتماد کیا جاتا ہو۔ اس کی عزت، عصمت اور عفت کا لحاظ رکھا جاتا ہو، یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم اس قوم کو غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے۔ ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یورپی اقوام سے کسی طرح کمتر قرار نہیں دیا جا سکتا انگلستان و ہندوستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کی جائے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے

انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔"

کرنیل سلیمان (جس نے ٹھگوں کی سرکوبی میں کارہائے نمایاں انجام دئیے تھے) کہتا ہے: "میرے تجربے میں صدہا مثالیں آچکی ہیں کہ ایک آدمی کی دولت، آزادی اور زندگی جھوٹ سے بچ سکتی تھی مگر وہ جھوٹ ہی نہ بولا۔"

(دادا بھائی حکومتِ خود اختیاری صـ۸۸)

سر ارسکن پیری (ایک سب کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہتا ہے: تجارتی کھاتوں کی وہ حرمت تھی کہ کسی متنازعہ لین دین کے بارے میں اُن کا پیش ہو جانا عدالت کے نزدیک ناقابلِ تردید شہادت سمجھا جاتا تھا۔"

(دادا بھائی صـ۱۹۲ حکومتِ خود اختیاری صـ۸۸)

آج بھی ان مقاموں کے بسنے والے ہندوستانیوں میں جو موجودہ تمدّن اور نظام سے بہت دُور ہیں پرانے اخلاقِ جمیلہ کی تیز جھلک دکھائی دیتی ہے مصنف خود اختیاری لکھتا ہے جو لوگ پہاڑوں پر جاتے ہیں وہ روزانہ دیکھتے ہیں کہ پہاڑیوں میں جھوٹ بولنے اور چوری کرنے کی قابلیت اب تک پیدا نہیں ہوئی۔ جو مال اُن کے سپرد کر دیا جاتا ہے اُسے وہ راستے میں ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اور اگر صحیح مقام کا پتہ نہیں چلتا تو اسے پولیس کی سپردگی میں دے دیتے ہیں۔ جن کی دیانت داری خود مشتبہ ہوتی ہے یہ عادات اُن کی اس وجہ سے قائم ہیں کہ ان کا اصلی وطن پہاڑوں میں موجودہ تمدّن سے دُور ہے۔" (صفحہ ۸۸)

مگر افسوس ہے کہ انگریزی راج نے ہندوستانیوں کی ان تمام خوبیوں

کو تقریباً مٹا دیا۔ اور ان کی بجائے تمام اخلاقی خرابیاں اور برائیاں پیدا کر دیں۔ لارڈ میکالے کہتا ہے: زمانہ سابق میں جس طرح زوردار اور باثر لوگوں کو افیون کے پوست پلا کر کاہل، پست ہمت اور بے عقل بنا دیا جاتا تھا ہمارا انتظامِ سلطنت اسی طرح اہلِ ہند کو بیکار کر دے گا۔

(حکومتِ خود اختیاری)

مدراس کے بڑے پادری صاحب نے ۱۸۷۶ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کو مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے: "آپ کے ملازموں کی بداعمالیوں سے ہندوستانیوں کی نظروں میں آپ کے خدا کی جتنی بے عزتی ہوتی ہے اور آپ کا مذہب جتنا بدنام ہو رہا ہے اس کی کیفیت اگر آپ کو معلوم ہو جائے تو آپ کے آنسوؤں کی ندیاں بہہ جائیں جو لوگ آتے ہیں اُن میں بعض تو قاتل ہیں بعض آدمیوں کے بھگا لے جانے کا کام کرتے ہیں، اور بعض انگلستان میں بیویاں چھوڑ کر آتے ہیں اور یہاں پھر شادیاں کر لیتے ہیں (برٹش انڈیا کے قدیم کاغذات از وہیلر ص۷)

(روشن مستقبل ص۳۴۰)

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک قرارداد منظور کر کے حکومت برطانیہ کو بھیجی ملاحظہ ہو:

کسی ذمہ داری کے کام پر جنٹلمین کو نہ رکھا جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ ہمیں اپنے کاروبار کے لئے اپنے ہی قسم کے لوگوں کا انتخاب کرنے کی اجازت دی جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شرفا ءکو

نوکر رکھنے سے (کمپنی کے عوام الناس (حصّہ دار) شبہہ میں پڑ کر روپیہ واپس لینے لگیں۔" (تاریخ برٹش انڈیا مصنفہ جیمیس مل صد ۲۳)

وارن ہیسٹنگز (جو کہ ہندوستان کا مشہور گورنر اور ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی بنیاد رکھنے والوں میں سے نمبر اوّل شمار کیا جاتا ہے) کہتا ہے:

انگریز ہندوستان میں آکر بالکل نیا انسان بن جاتا ہے۔ جن جرائم کی وہ اپنے ملک میں کبھی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا ہندوستان میں اُن کے ارتکاب کے واسطے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اس کو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا۔" (علم المعیشت برنی صد ۵۸۹)

ٹامس ہنہم لکھتا ہے: میں ہمیشہ سے دیکھتا ہوں کہ بہ مقابلہ اور قوموں کے انگریز ممالکِ غیر میں سب سے زیادہ چیرہ دستی کرتے ہیں۔ اور ہندوستان میں بھی یہی واقعہ پیش آرہا ہے۔ (علم المعیشت برنی صد ۵۸۹)

دوسری جگہ برک کہتا ہے:

"تاتاریوں کی یورش سے بیشک ہندوستانیوں کو نقصان پہنچا تھا مگر ہماری حفاظت ہندوستانیوں کو تباہ کئے ڈالتی ہے۔ نوعمر لونڈے ملک پر حکومت کر رہے ہیں جہاں کے باشندوں سے نہ اُن کا میل جول ہے اور نہ اُن سے ہمدردی ہے، دولت کی ہوس اور تیز مزاجی جتنی کہ کسی جوان میں ہو سکتی ہے وہ ان لوگوں میں بھری ہوتی ہے اور ملک میں اُن کی آمد کا تانتا لگا ہوا ہے۔ ایک کھیپ لوٹتی ہے تو دوسری پہنچ جاتی ہے۔ ہندوستانی

رعایا کے سامنے مستقبل کی صرف ایک مایوس کن صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک غیر محدود زمانے تک ان موسمی شکاری پرندوں کے نئے غول اس طرح آتے جاتے رہیں گے جن کی بھوک ہر مرتبہ اور تیز ہوتی رہے گی۔ درآنحالیکہ جس چیز کے وہ بھوکے ہیں وہ کمیاب ہوتی جائیگی"۔

(روشن مستقبل ص۲۹ از تصانیف برک جلد ۳ ص۴۷۴)

مسٹر سی ہل کہتا ہے "جس زمانہ میں کمپنی کی ملازمت محض تجارتی تھی اور کمپنی کے ملازمان ملک کے حالات سے ناواقف تھے تو وہ اکثر چھوٹے ملازموں سے جو بنئے کہلاتے تھے کام لیا کرتے تھے۔

(روشن مستقبل ص۵۱)

مسٹر برک ان بنیوں کے متعلق مندرجہ ذیل کلمات لکھتا ہے:

"بنیا یا دیوان انگریز کے گھر کا منتظم ہوتا ہے۔ وہ ان تمام چالبازیوں فریب اور عیاریوں سے واقف ہوتا ہے جو مظالم کی سزا سے بچنے کے لئے ایک غلام استعمال کرتا ہے۔ بنیا لوٹتا ہے۔ استحصال بالجبر کرتا ہے غارت گری کرتا ہے اور پھر اس میں سے جس قدر مناسب سمجھتا ہے اپنے صاحب کو بھی دے دیتا ہے ان بنیوں نے بڑے بڑے گھر اُلٹ دیئے ہیں۔ ملک کو برباد کر دیا ہے اور سرکاری مالگزاری کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ خود حکام وقت (انگریز) ان کے ذریعے سے ذاتی نفع حاصل کرتے تھے چنانچہ بہت سے علاقے بنیوں کے نام ٹھیکے پر دیئے جاتے تھے لیکن اصلی ٹھیکیدار کوئی بااختیار انگریز ہوتا تھا جو خود پردے میں رہتا تھا چنانچہ

انھیں انگریز ٹھیکہ داروں کی بدولت پرانے پرانے شریف اور خاندانی ہندو اور مسلمان اپنی اپنی زمینداریوں سے جبراً اور ملک کے دستور کے خلاف بے دخل اور محروم کر دیئے گئے۔ اس وقت کے قانون کی رو سے ایک شخص کو ایک لاکھ سے زائد مالگزاری کا ٹھیکہ دینا جائز نہ تھا، مگر بڑے بڑے صاحب لوگوں کے بنئے قانون سے آزاد تھے۔ خود وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل کا بنیا کنتو بابو تیرہ لاکھ کا ٹھیکیدار تھا۔"

(برک مقدمہ ہیسٹنگز جلد اول ص ۱۳۹)

ایک دوسرا بنیا گنگا گوبند بھی وارن ہیسٹنگز کا آلہ کار تھا اور اس کی نسبت دارالعوام میں جولائی ۱۸۵۸ء میں ایک حساب دکھایا گیا تھا جس کی رو سے گنگا گوبند سنگھ کی کمائی تین کروڑ بیس لاکھ کے قریب پہنچی تھی۔

(برک مقدمہ ہیسٹنگز جلد اول ص ۲۱۳)

اسی طرح گورنر کے دیوان رام چندر کی نسبت بیان کیا گیا تھا کہ وہ ساٹھ روپے ماہوار کا ملازم تھا مگر اس نے ساڑھے بارہ کروڑ کے قریب ترکہ چھوڑا۔ کمپنی کے ایجنٹ روپ کشن کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس نے ماں کے مرنے پر نوے لاکھ روپیہ صرف کیا۔ یہ اتنی رقم کہاں سے آئی صرف دغابازی، فریب کاری اور لوٹ کھسوٹ سے۔ ایک دوسرا بنیا دیبی سنگھ بھی کلکتہ کی حکومت کے محبوب بنیوں میں سے تھا۔ چنانچہ بنگال کے بڑے بڑے علاقے اسی کو ٹھیکے پر دیئے گئے تھے۔ دیبی سنگھ آبرودار لوگوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر حوالات میں رکھتا اور اضافہ کا اقرار

کرانا تھا۔ اُس نے مالگزاری کے علاوہ نئے نئے محصول اور ابواب ایجاد کر لئے تھے۔ اور جب زمیندار پر بقایا لوٹتی تو اس کی زمینداری سستے داموں نیلام کرا کر خود مول لے لیتا اور یہ قیمت بھی اُسی روپئے سے ادا کرتا جو انھیں زمینداروں سے پیشگی وصول کر چکا ہوتا۔ اس بنئے نے اکثر معافیاں چار چار آنے بگیہ کے حساب سے مول لے لی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاقے کے علاقے ویران ہو گئے اور بقول مسٹر برک زمیندار گھربار اور نوکر چاکر سب چھوڑ نکلے اور بھاگنے سے پہلے اپنی آنکھوں دیکھ لیا کہ وہ اوقاف نیلام ہو رہے ہیں جو انھوں نے یا ان کے بزرگوں نے خدا کی راہ میں اس لئے دے رکھے تھے کہ اُن کی آمدنی سے بیواؤں، یتیموں، لنگڑے لولوں اور اپاہجوں کی امداد کی جاتی۔ وہ جائدادیں بھی جو اُنھوں نے کفن دفن اور مرنے کی رسموں کے لئے علیحدہ کر رکھی تھیں۔ فروخت کر دی گئیں۔ افسوس کہ جان کنی کے وقت سکون اور اطمینان سے گزر جانے کا سہارا بھی اس ظالم ہاتھ نے قطع کر دیا۔ اُف کیسا ظالم ہاتھ تھا جس کا ظلم چتا کی آگ سے زیادہ جلانے والا، قبر سے زیادہ حریص اور موت سے زیادہ بے رحم تھا۔"

(روشن مستقبل ص۵۲، ۵۳، ۵۴ از برک کی تقریر ج ا ص ۲۱۹، ۲۲۰)

سر ولیم وڈربرن لکھتا ہے:

"بالعموم ہمارے اعلیٰ عہدہ داروں کو اپنے خلاف مزاج سچی باتیں ناگوار معلوم ہوتی ہیں اور اس وجہ سے وہ لوگوں کے معتمد علیہ اشخاص کو

اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے اور اپنی مراعات و کرم اُن لوگوں کے لئے مخصوص رکھتے ہیں جو ذلیل ترین، خوشامدی اور ہندوستانیوں کے مفاد کے لئے سخت خطرناک جماعت ہے۔"

(حکومت خود اختیاری صفحہ ۵ از تقاریر و تحاریر وڈربرن صفحہ ۲۰۴-۲۰۸)

"ملک کے تمام ذمہ داری کے عہدوں سے ہندوستانیوں کے خارج ہونے کا قدرتی نتیجہ یہ ہؤا کہ اعلیٰ انتظامی قابلیت کی نشو و نما کرنے کے مواقع جاتے رہے اور جو کچھ بھی ان کی قابلیت تھی وہ رفتہ رفتہ زائل ہوگئی۔ اُسی کے ساتھ ان کے مالی تنزل نے ان کے کیریکٹر کو اس درجہ تک گرا دیا جس پر مظلوم اور محکوم قومیں پہنچ جاتی ہیں۔"

(حکومت خود اختیاری صفحہ ۱۵)

سر طامس منرو کو بخوبی علم ہؤا جس کا اظہار انھوں نے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔ "اور قوانین کے عملدرآمد میں ان کو بہت کم دخل ہے۔ بہ استثنار چند نہایت چھوٹے عہدوں کے کسی بڑے عہدے تک خواہ وہ فوجی ہو یا سول نہیں پہنچتے وہ ہر جگہ ایک نہایت ادنیٰ قوم کے فرد سمجھے جاتے ہیں۔ تمام فوجی اور دیوانی عہدے جو کچھ بھی اہمیت رکھ سکتے ہیں اب یورپینوں کے قبضے میں ہیں۔ جن کا پس انداز روپیہ خود اُن کے ملک کو چلا جاتا ہے۔" اس طرح ذمہ دار عہدوں سے نکل جانے کی بنا پر ہندوستانیوں کے کیریکٹر اور اخلاق پر نہایت مضر اور ہلاکت آفریں اثر پڑا۔ اور وہ بدترین اخلاق میں مبتلا ہو گئے۔

چنانچہ سر طامس منرو ۱۸۲۳ء میں لکھتا ہے :

" اگر برطانیہ کسی بیرونی سلطنت کا مفتوحہ ملک ہو جاتا اور اس کے باشندے اپنے ملک کے انتظامات سے خارج کر دیئے جاتے تو ان کے تمام علوم اور تمام علم ادب خواہ وہ مذہبی ہوں یا دنیوی رکھیں ایک یا دو نسلوں کے بعد کمینہ، چالاک (دغاباز) اور بے ایمان قوم ہو جانے سے نہ بچا سکتا تھا۔ (حکومتِ خود اختیاری ص ۱۹)

مسٹر لڈلو اپنی کتاب برٹش انڈیا میں لکھتا ہے :

" انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کے فتح ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بجائے ابھرنے کے اس کے تمام باشندے ذلیل ترین ہو جائیں گے"

(حکومتِ خود اختیاری ص ۱۹)

سر طامس منرو کہتا ہے : " انگریزی صوبجات کے رہنے والے فی الواقع ہندوستان میں سب سے زیادہ ذلیل اور کمینے ہیں "

(حکومتِ خود اختیاری ص ۱۹)

الحاصل سینکڑوں زمیندار، ہزاروں سپاہی اور بے شمار ملازم بے روزگار ہو گئے اور انھوں نے لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر لیا۔ چنانچہ ناگپور سے لے کر خلیج بنگال تک تیئس ہزار پنڈاری لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔ جنھوں نے ۱۸۱۹ء کے موسم سرما میں صرف دس دن کے اندر ۱۸۲ آدمی قتل کئے، ۵۰۰ زخمی کئے، تین ہزار کو طرح طرح کی ایذائیں دیں، اور تقریباً ایک کروڑ کا مال لے گئے۔

(روشن مستقبل ص۵۹، ۶۰ "اغیار کے گھر کے" از فلیٹنگ ص۲۵)

ان کی فطرت، ان کی عزت، ان کے مذہب، ان کی عورتوں کی عفت کے قوی محسوسات کو اس بدعت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مال کی کارروائیوں میں پہلا قدم جو اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ مال گزاری کی بقایا میں لوگ گرفتار کیے جاتے لگے۔ درآنحالیکہ ایک معزز ہندوستانی کے لئے گرفتاری محض نظربندی نہ تھی بلکہ بدترین ذاتی بے عزتی تھی۔ ہر مقدمے کی ہر منزل پر حلف لئے جانے لگے۔ درآنحالیکہ معزز ہندوستانیوں کے نزدیک فرقہ کو یکسر سے (جو قسم کو معیوب سمجھتا ہے) یہ طریقہ زیادہ تکلیف دہ تھا۔ مشرقی ممالک میں معزز گھرانوں کے زنانخانوں میں غیر آدمی کا داخل ہونا یا عورتوں کے چہروں کو دیکھ لینا ایک ناقابلِ برداشت زیادتی سمجھی جاتی ہے اور اس کو موت سے بھی زیادہ بدتر خیال کیا جاتا ہے اور جس کا انتقام صرف خونریزی سے ہی لیا جا سکتا ہے، بنگال، بہار اور اڑیسہ کے نہایت معزز خاندانوں کو اس قسم کی بے عزتیوں کا سامنا ہوتا۔ عدالتوں کے گرد ہندوستانی آبادی کے بدترین لوگ جمع ہو گئے۔ یہ لوگ چغل خور، جھوٹے گواہ، مقدمہ ساز، دغاباز اور سب سے بڑھ کر قرقی کرنے والے لوگوں کا وہ گروہ تھا جس کے مقابلے میں انگلستان کے بدترین بیج باز نہایت دیانت دار اور رقیق القلب معلوم ہوتے ہیں۔"

(حکومت خود اختیاری ص ۱۵ تا ۱۷ از میکالیز)

تعلیمی عروج وزوال

قدیم تعلیمی ہند

اس زمانے میں یہ کیفیت تھی کہ والیانِ ملک اور امراء تعلیم کی پوری سرپرستی کرتے تھے۔ اس کے لئے جاگیریں دیتے اور جائدادیں وقف کرتے تھے۔ دہلی کی مرکزی حکومت ٹوٹ جانے پر بھی صرف اضلاع روہیل کھنڈ میں جو دہلی سے قریب تر تھے پانچ ہزار علماء مختلف مدارس میں درس دیتے تھے۔ اور حافظ الملک (نواب روہیل کھنڈ حافظ رحمت خاں مرحوم) کی ریاست سے تنخواہیں پاتے تھے۔

(حیات حافظ رحمت خاں ص۲۷۱)

کپتان الیگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامے میں شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم کے زمانے کی حالت بتلاتا ہوا لکھتا ہے کہ صرف شہر ٹھٹھہ سندھ میں چارسو کالج مختلف علوم و فنون کے تھے۔ (یہاں لفظ کالج ہے نہ کہ مدرسہ۔ غور کیجئے کہ مدارس کا کیا حال ہوگا)

مقریزی "کتاب الخطط" میں لکھتا ہے (یہ زمانہ محمد تغلق مرحوم) صرف شہر دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔

(برطانوی تعلیمی ہند)

مسٹر کیر ہارڈی نے میکس مولر کے حوالے سے لکھا ہے:

"انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسّی ہزار مدرسے تھے۔ اس طرح چار سو آدمیوں کی آبادی کے لئے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا۔ نیز لڈلو نے تاریخ ہند میں لکھا ہے: "ہندوؤں کے ہر موضع میں جو اپنی قدیم حالت پر رہے بچے بالعموم لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ مگر جس جگہ ہم نے مثل بنگال کے پرانا نظام توڑ دیا ہے وہاں سے گاؤں کا اسکول غائب ہو گیا ہے۔"

(تاریخ باسو جلد پنجم ص۱۱۱۔ روشن مستقبل ص۱۲۲)

اسی طرح انڈین ریفارم سوسائٹی نے جو کہ ۱۸۵۳ء میں انگلستان میں قائم تھی اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے: "ہندوؤں کے زمانہ میں ہر گاؤں میں ایک مدرسہ ہوتا تھا۔ ہم نے چونکہ دیہاتی کمیٹیوں یا میونسپلٹیوں کو توڑ دیا ہے اس سے اُن کے باشندے مدارس سے بھی محروم ہو گئے۔ اور ہم نے اُن کی جگہ کوئی چیز قائم نہیں کی۔

(روشن مستقبل ص۱۲۲)

سر ولیم ڈگبی پر سپرس برٹش انڈیا میں لکھتا ہے: (ضمنی سوال و جواب میجر جنرل اسمتھ کے۔ سی۔ بی) سوال ۵۶۳۰: کیا آپ کسی طرح اس بات کی روک کر سکتے ہیں کہ دلیسیوں کو اُن کی طاقت کا علم نہ ہو؟

جواب: میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ معدودے چند اغیار چھ کروڑ آبادی کے ملک پر حکمرانی کر سکیں جسے آجکل رائے کی بادشاہت کہتے ہیں اس لئے جونہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تعلیم

کی تاثیر سے ان کے قومی اور مذہبی تفرقے دور ہو جائیں گے جس کے ذریعہ سے ہم نے اب تک اس ملک کو اپنے قبضے میں رکھا ہوا ہے یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف کرنا۔ اور علیٰ ہٰذا القیاس تعلیم کا یہ اثر ضرور ہوگا کہ ان کے دل بڑھ جائیں گے اور انھیں اپنی طاقت سے آگاہی ہو جائے گی

(خوشحال برطانوی ہند ترجمہ اسپرس برٹش انڈیا ص ۱۰۹)

چنانچہ ۱۸۲۳ء میں آنریبل الفنسٹن اور آنریبل الیف وارڈن نے ایک متفقہ یادداشت گورنمنٹ کو پیش کی جس کا اقتباس حسب ذیل ہے:

"انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف ان کی علمی ترقی کی ہمت افزائی کے تمام ذرائع کو ہٹا لیا ہے بلکہ حالت یہ ہے کہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس الزام کو دور کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔

(روشن مستقبل ص ۱۲۸)

کمپنی تعلیم کی مخالفت میں اور خصوصاً مذہب عیسائی کی تبلیغ و تعلیم کے خلاف ایک قرارداد پاس کرتی ہے ملاحظہ ہو:

"ایک مذہب کے قائم ہو جانے سے انسانوں کے مقاصد متحد ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ ہو گیا تو ہندوستان میں انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لوگوں کو اپنے مذہب میں لانے کا اصول اس اٹھارھویں صدی میں خلاف مصلحت ہے۔ اگر چند لاکھ عیسائی بھی وہاں ہو گئے تو اس سے سخت

مصیبت آجائے گی۔ امریکہ میں درس گاہیں اور کالج قائم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی طرح جب نوجوان پادری ہند میں پھیلیں گے تو کمپنی کے فوائد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جس ہندوستانی کو تعلیم حاصل کرنی ہو وہ انگلستان چلا آئے۔

(روشن مستقبل ص۱۲۵ از تاریخ تعلیم میجر باسو ص۲۰۳)

پہلے تو انگریز نے ہندوستانیوں کو جاہل رکھنا اپنے اقتدار کے لئے مفید سمجھا پھر پالیسی بدل دی اور ایسی تعلیم پر زور دیا جانے لگا جو کہ ہندوستانیوں کو انگریز بنانے میں مددگار ہو۔ ملاحظہ ہو۔

برطانیہ نے تعلیم کو اپنے استحکام کا ذریعہ بنایا

بہت سے منصف مزاج انگریز ہندوستانیوں کی موافقت بھی کرتے رہے جس کے نتیجے میں ۱۸۳۴ء میں تعلیمی ضروریات انجام دینے اور اس کے پروگرام وغیرہ کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا اجلاس ۷۔ مارچ ۱۸۳۵ء میں منعقد ہوا۔ اور لارڈ میکالے اس کے صدر بنائے گئے۔ کمیٹی اور اس کے صدر نے ہندوستانیوں کے لئے تعلیم گاہیں بنانے اور تعلیم کی ضرورت کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا۔

چنانچہ لارڈ میکالے اور اس کی کمیٹی اپنے تعلیمی اغراض و مقاصد اور ان کی اسکیم کی رپورٹ میں مندرجہ ذیل کلمات تحریر کرتی ہے:

ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا

کے درمیان مترجم ہو۔ اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔

(روشن مستقبل ص ۱۳۱ از تاریخ التعلیم میجر باسو ص ۱۰۵)

ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر کہتا ہے: ہمارے اینگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباد اجداد کے مذہب سے انکار نہ کرنا جانتا ہو۔ ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس بستہ حقائق کے مقابلے میں آتے ہیں تو سوکھ کر کانٹ ہو جاتے ہیں۔ (ترجمہ رسالہ "ہمارے ہندوستانی مسلمان" ص ۲۰۲)

انگریز نے تعلیم کے ذریعے ہندوستانیوں میں تفرقہ ڈالنے کی ملعونہ تحریک چلائی ایسی کتابیں تیار کی گئیں جن میں مسلمان بادشاہوں کے مفروضہ مظالم بیان کر کے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارا چنانچہ اس مقصد کیلئے ایسی کتابوں کو کورس میں داخل کیا گیا اور انگریز اس میں کامیاب رہا۔

(سر جان میلکم) اس قدر وسیع ملک میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ہیں ان کی عام تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں جب تک یہ لوگ اس طریقے سے جدا رہیں گے اس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اُٹھ کر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہ کریگی۔

انگریز نے تعلیم کے ذریعے ہندوستانیوں میں تفرقہ ڈالا

اسی مقصد کے لئے ایسی تاریخیں لکھی گئیں جن میں ہندوؤں پر مسلمان بادشاہوں کے فرضی اور غیر واقعی مظالم بھیانک صورتوں میں دکھلائے گئے۔ جن میں سے مشہور سر ہنری ایلیٹ کی ہے۔ کپتان ایلیٹ لکھتا ہے کہ "بڑا افسوس ہندو مصنفین تاریخ پر آتا ہے جن سے ہمیں توقع ہو سکتی تھی کہ اس قوم کے محسوسات اور معتقدات ہمیں معلوم ہوتے مگر وہ تو اسلامی احکام اور ہدایات کے مطابق لکھتے ہیں۔ ماہ محرم کو محرم شریف اور قرآن کو کلام پاک کہتے ہیں۔ اپنی تحریرات کو بسم اللہ سے شروع کرتے ہیں۔

ایلیٹ صاحب کو ہندوؤں پر غصہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا احترام کیوں کرتے ہیں۔ چنانچہ آگے چل کر لکھتا ہے: "اب جب کہ ہندو اپنے ظالم (یعنی مسلمان) آقاؤں کے چنگل سے نکل کر آزاد ہو گئے اور بغیر روک ٹوک کے اپنے دل کی آہیں ظاہر کر سکتے ہیں تب بھی ان غلامانہ ذہنیت کے لوگوں میں سے ایک بھی اپنے ملک کے محسوسات کے مطابق نہیں لکھتا۔ یا طویل زمانے کی مظلومیت کے خیالات اور جذبات کا اظہار نہیں کرتا۔"

ان کے بعد مسٹر ٹیمسن ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے اسی نوعیت کی ایک تاریخ لکھی جس کی شکایت سر سید احمد خاں نے کی ہے لیکن منصف مزاج انگریزوں نے خود اس کی تردید کی اور اس قسم کے واقعات کو غلط ثابت کیا۔ چنانچہ ڈبلیو ایم ٹارانس اپنی کتاب "ایشیا میں شہنشاہیت" میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

تیواجی کو متعصب اور سلطان ٹیپو کو کٹر مذہبی کہا جاتا ہے لیکن جس وقت ہم نے جنوبی ہند کی ریاستوں میں دخیل ہونا شروع کیا اس وقت ان کے یہاں اس قسم کے مذہبی تنفر کا کہیں نام تک نہ تھا جس طرح انگلستان اور یورپ کے تقریباً سب حصوں میں مخلوق کو تباہ کرنا روا رکھا جاتا تھا۔ جب آئرلینڈ میں کوئی رومن کیتھولک نہ اپنے بزرگوں کی جاگیر کا حقدار سمجھا جاتا تھا نہ فوج کا افسر ہو سکتا تھا۔ جب سوئٹزرلینڈ میں سوائے لوتھر کے معتقدین کے اور کسی عقیدہ کا کوئی ملازم نہیں ہو سکتا تھا ٹھیک اس وقت ہندوستان کے اندر ہر شہر اور شاہی دربار میں ہندو مسلمان عزت اور سرمایہ کماتے ہیں اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں آزاد تھے۔"

مذہبی تہوار بدستور قائم، بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے منائے جاتے تھے اور مسلمانوں کی جانب سے کسی طرح کی روک ٹوک نہ ہوتی تھی۔ گانے، باجا اور محرم و رام لیلا کے قضیوں کا وجود نہ تھا۔ اور روہیلوں کے ابتدائے زمانہ حکومت سے انتہا تک کسی ہندو مسلم فساد کا پتہ نہیں ملتا۔ پہلا ہندو مسلم فساد دارالحکومت بریلی میں ۱۸۳۷ء میں جب کہ روہیلوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔"

لارڈ الفنسٹن گورنر بمبئی ۱۴۔ مئی ۱۸۵۹ء میں ایک یادداشت میں لکھتا ہے: "نفاق ڈال کر حکومت کرنا رومیوں کا اصول تھا اور یہی اصول ہمارا بھی ہونا چاہیئے۔" (حکومت خود اختیاری ص۵۵ از ان ہیپی انڈیا)۔

اس سے پہلے کارتے شکیس نے رسالہ ایشیاٹک جنرل میں ۱۸۲۱ء میں لکھا تھا:

"لڑاؤ اور حکومت کرو" رومن کا مقولہ ہماری ہندوستانی حکومت کا اصل اصول ہونا چاہیئے۔ عام اس سے کہ وہ سیاست یا تمدن یا فوج کشی کے متعلق ہو" (حکومت خود اختیاری ص۵۲)

مسٹر ایڈورڈ ٹامسن اپنی کتاب (انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ) میں لکھتا ہے:

"برٹش سیاست کو مدنظر رکھتے ہوئے تو ہم نے مسٹر گلیڈ اسٹون اور لارڈ سیلبری جیسے مشہور زمانہ مدبرین کے خیالات کو چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ وقت کی رفتار ان کے برخلاف حکم دیتی تھی لیکن ہندوستان کے متعلق ہم ابھی تک اسی فرسودہ پالیسی پر عمل کر رہے ہیں یہاں تک کہ ہندوستانیوں میں نا اتفاقی اور باہمی اختلافات کو زندہ رکھنا قدیم سے ہمارے سیاست دانوں کا نہایت مرغوب شغلہ بنا ہوا ہے لیکن ہندوستان اتفاق اور اتحاد کی ضرورت کا بیش از بیش احساس نہایت تیزی سے کر رہا ہے۔ (انقلاب ۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ مترجم ص۱۰۸)

مندرجہ ذیل سوال وجواب میں میجر جنرل اسمتھ کے ۔سی۔بی کی عجیب و غریب شہادت ملاحظہ فرمائیے۔ (سر ولیم ڈگبی از ترجمہ پراسپرس برٹش انڈیا ص۱۰۹)

سوال: ۵۶۳۰ء کیا آپ کسی طرح اس بات کی روک کر سکتے ہیں کہ دیسی

کو اپنی طاقت کا علم نہ ہو۔

جواب: میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ معدودے چند اغیار چند کروڑ آبادی کے ملک پر حکمرانی کر سکیں جسے آجکل رائے کی بادشاہت کہتے ہیں۔ اس لئے جونہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تعلیم کی تاثیر سے اُن کے قومی اور مذہبی تفرقے دُور ہو جائیں گے جس کے ذریعے سے ہم نے اب تک اس ملک کو اپنے قبضے میں رکھا ہوا ہے یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف کرنا علی ہٰذا القیاس تعلیم کا اثر یہ ہوگا کہ اُن کے دل بڑھ جائیں گے اور انھیں اپنی طاقت سے آگاہی ہو جائے گی۔"

مسٹر چرچل ۲۷۔ جون ۱۹۳۲ء کو تقریر کرتے ہیں:

"وزیر اعظم (مسٹر میکڈانلڈ) نے طے کر لیا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فیصلہ دیں گے۔ میرے نزدیک اس میں سخت خطرہ ہے۔ اگر انھوں نے جملہ جماعتوں کو خوش کرنے کی کوشش کی تو وہ کسی کو خوش نہ کر سکیں گے اہل روم کا اصول تھا کہ نفاق ڈال کر حکومت کرو لیکن ہم نے بالاتفاق طے کر لیا ہے کہ یہ اصول نامناسب ہے مگر اسی کے ساتھ اس اصول کو بھی اختیار نہ کرنا چاہیئے جو اس کے برعکس ہو اور وہ یہ ہے کہ رعایا کو متحد کر دیا جائے جس کا نتیجہ سلطنت سے دست کشی ہوگا۔ دراصل یہ ایک بڑا خطرہ ہے اور اندیشہ ہے کہ ہم اس بڑے خطرے میں نہ پڑ جائیں۔

(لیڈر اخبار مورخہ ۱۴۔ جولائی ۱۹۳۲ء)

سرجان میناروڈ: "ہندو مسلمانوں کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔"

(ان ہیپی انڈیا ص۳۰ روشن مستقبل ص۲۳۱)

ہندو مسلم اختلاف کا ایک انوکھا طریقہ ملاحظہ ہو:

"آنریبل امبکا چرن مزمدار کہتا ہے: اوّل اوّل اپنی عملداری کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو بڑھایا گیا۔ اور اس کے بعد ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کو اٹھایا گیا۔ جو باہمی رنجش اور عداوت کا موجب ہوا۔"

(ہندوستان کا قومی ارتقاء ص۲۴۷، روشن مستقبل ص۱۵۵)

اور مسٹر آر۔ ایس۔ روئیکار آف سی۔ پی اپنے مشاہدات اور تاثرات ۱۹۔ نومبر ۱۹۴۶ء کو الفاظ ذیل میں انگلستان سے واپسی پر ذکر کرتے ہیں:

"سوئٹزرلینڈ، آئرلینڈ اور برطانیہ کے دوران میں مجھے سرکردہ لیڈروں قانون دانوں، جرنلسٹوں اور تاجروں سے ملنے کا موقع ملا۔ جب میں لندن میں تھا تو میں نے یہ افواہیں سنیں کہ کچھ کنسرویٹو ہندوستان کے فسادات میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ وہ ہندوستان میں فسادات کرانے کے لئے رجعت پسند عناصر کو مالی امداد بھی دے رہے ہیں۔ ان دنوں وہاں یہ افواہ بھی گشت لگا رہی تھی کہ کنسرویٹو پارٹی کا ایک ایلچی فسادات کرانے کے لئے ہندوستان روانہ

ہو چکا ہے"

(پرتاپ لاہور مورخہ ۲۱ ۔ نومبر ۱۹۴۶ء جلد ۲۷ و ۱۲۱)

خلاصۂ بحث

غرضیکہ انگریز نے ہندوستانیوں کے اعلیٰ اخلاق کو تباہ و برباد کیا۔ اور اس کے منبع و سرچشمہ دولتِ علم سے ہندوستانیوں کو پہلے پہلے محروم رکھا گیا اور پھر ایسا طریقہ رائج کیا گیا جو ایک طرف تو مذہب سے بیزاری پیدا کر کے ہندوستانی نوجوانوں کو اپنے مذہب سے باغی اور انگریز کا وفادار بنا تے اور دوسری طرف باہمی اختلافات و تفرقہ کا ذریعہ بنے تاکہ (اختلاف ڈالو اور حکومت کرو) کے مشہور اصول کے مطابق انگریزی اقتدار دن بدن مضبوط اور مستحکم ہوتا جائے ۔ یہی وہ اخلاقی مظالم تھے جنہوں نے ہندوستانیوں کو انگریز کے خلاف جہادِ حریت لڑنے پر مجبور کیا۔

یہاں مثالبِ اخلاقیہ کی بحث ختم ہوتی ہے۔

مسائلِ معاشیہ کا بیان

ہندوستان کا معاشی ماضی

ڈاکٹر واکر کہتا ہے: "ہندوستان کی دولت، تجارت اور خوشحالی نے سکندر اعظم کے دل پر گہرا اثر کیا اور جب وہ ایران سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا تو اس نے اپنی فوج سے کہا کہ اب تم اس سنہرے ہندوستان کی طرف کوچ کر رہے ہو جہاں نہ ختم ہونے والے خزانے ہیں اور جو کچھ انھوں نے ایران میں دیکھا ہے اُس کا ہندوستان کی دولت کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتا۔"

(رسالہ تلک جلد اوّل نمبر ۶)

پروفیسر ہیرن "ہسٹاریکل ریسرچ" ص ۲۶۸ میں کہتا ہے:

"ہندوستان پرانے زمانہ میں دولت کے لئے مشہور تھا۔"

(رسالہ تلک جلد ۱ نمبر ۶)

چیمبرس انسائیکلوپیڈیا میں ہے:

"صدیوں تک ہندوستان اپنی دولت مندی کے واسطے مشہور

رہا۔"   (رسالہ ملک جلد ۱ نمبر ۶)

تھارنٹن اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:

"یورپ کو تہذیب سکھانے والے یونان اور اٹلی جب بالکل جنگلی حالت میں تھے ہندوستان اس زمانے میں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ اور دولت کا مرکز تھا۔ یہاں چاروں طرف بڑے بڑے صنعت و حرفت کے کاروبار جاری تھے۔ یہاں کے باشندے دن رات اپنے اپنے کاروبار میں مشغول رہتے تھے۔ یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی جس سے فصل خوب پیدا ہوتی تھی۔ یہاں بڑے بڑے لائق اور کاریگر صناع موجود تھے جو یہاں کی خام پیداوار سے اتنا نفیس اور عمدہ مال تیار کرتے تھے جس کی دُنیا بھر میں مانگ تھی۔ مغرب اور مشرق کے تمام ممالک ان اشیاء کو بڑے شوق سے خریدتے تھے۔ یہاں سوت کے کپڑے اس قدر عمدہ اور باریک نفیس و خوبصورت بنتے تھے کہ دُنیا میں کوئی مُلک بھی ان کی برابری نہ کر سکتا تھا۔"

(رسالہ مظلوم کسان صہ ۱۳)

فرانس کے مشہور سیاح برنیر نے اپنی چھٹی میں مسٹر کالبرٹ کو ہندوستان کی نسبت لکھا تھا کہ "وہ ایسی بے پناہ خلیج ہے جس میں دُنیا بھر کے سونے اور چاندی کا بڑا حصہ ہر طرف سے آکر جمع ہو جاتا ہے اور بمشکل ایک طرف سے باہر کو نکلتا ہے۔"

(روشن مستقبل صہ ۱۵)

عبداللہ وصاف مؤرخ لکھتا ہے :

"حضرت آدم (علیہ السلام) کے زمانے سے اس وقت تک مشرق سے لے کر مغرب تک اور جنوب سے لے کر شمال تک کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں باہر کے ملکوں سے سونا اور چاندی اور قیمتی سامان اور جنس آتی ہو۔ اور اس کے بدلے میں کانٹے، جڑی بوٹی، مٹی، گھر، پنسے اور مختلف قسم کی جڑیں باہر جاتی ہوں۔ اور جہاں سے سامان کی خریداری کے لئے کسی ملک کو کبھی روپیہ نہ گیا ہو۔"

(روشن مستقبل صلا)

لارڈ میکالے لکھتا ہے :

"باوجود مسلمان ظالموں اور مرہٹہ لٹیروں کی موجودگی کے مشرقی ممالک میں صوبہ بنگال باغِ ارم سمجھا جاتا تھا۔ اس کی آبادی بے حد و غایت بڑھتی تھی۔ غلے کی افراط سے دور و دراز کے صوبہ جات پرورش پاتے تھے۔ اور لندن اور پیرس کے اعلیٰ خاندانوں کی بی بیاں یہاں کے کرگھوں کے نازک ترین کپڑے زیبِ تن کرتی تھیں۔"

(روشن مستقبل صلا)

میجر باسو لکھتا ہے :

"رعایا کی خوش حالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دورِ حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ دولتمندی اور آرام و چین کا جو نقشہ شاہجہاں کے وقت میں دیکھنے میں آتا تھا بلاشبہ

بے مثل و بے نظیر تھا۔" (روشن مستقبل صفحہ ۱۶)

فاھیان چینی اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے:

"یہاں کی رعایا نہایت خوشحال اور فارغ البال ہے کسی قسم کا مالیہ یا محصول ادا کرنا نہیں پڑتا۔ اور نہ افسروں کی ڈالی ہوئی رکاوٹیں ہی ان لوگوں کے کاروبار میں حائل ہیں جو سرکاری زمین جوتتے ہیں وہ پیداوار کا بہت تھوڑا حصہ بطور لگان ادا کرتے ہیں۔ راجہ کسی کو بدنی سزا نہیں دیتے۔" (رسالہ مظلوم کسان ص ۱۳)

نکوموڈی کانتی (مشہور انگریز) اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے:

"گنگا کے کنارے بڑے بڑے اور نہایت خوبصورت شہر آباد ہیں۔ جن کے ارد گرد دل خوش کرنے والے باغیچے لگے ہوئے ہیں۔ شہروں کے باہر نہایت خوبصورت کھیت لہرا رہے ہیں۔ یہاں گویا سونے کے دریا بہہ رہے ہیں۔ موتی اور جواہرات کی بھی کوئی انتہا نہیں۔"

(رسالہ مظلوم کسان ص ۱۴)

مسٹر ڈی ور ۱۸۷۱ء میں لکھتا ہے:

"سراج الدولہ کے انتقال کے بعد جن لوگوں نے بنگال میں ہو کر کوچ کیا ہے۔ اُن سے اس بات کی تصدیق کرانا چاہتے ہیں کہ اس وقت یہ سلطنت دُنیا میں سب سے زیادہ دولت مند، آباد اور کاشت کے اعتبار سے بہترین تھی۔ یہاں کے شرفاء اور تاجر دولت اور عیش میں لوٹ لگاتے تھے۔ اور ادنیٰ درجے کے کسانوں اور کاریگروں پر خوش حالی اور آسائش کی برکتیں

نازل ہوتی تھیں ۔" (روشن مستقبل صـ ۲۴۳)

۱۷۷۳ء میں تقریباً ایک ہزار قسم کے سکے کم و بیش تمام ملک میں رائج پائے گئے ۔ خاصکر ۹۳۱ قسم کی طلائی مہریں (اشرفیاں) ۱۴۱ قسم کے طلائی ہن جو پگوڈا بھی کہلاتے تھے ، ۵۵۶ قسم کے نقرئی سکے اور ۲۱۴ قسم کے دوسرے ممالک کے سکے ۔ صرف احاطہ بمبئی کو لیجئے کہ عدالت ہائے دیوانی کی ہدایت کے واسطے جو مروجہ سکوں کی فہرست بنائی گئی تھی اس میں ۳۸ طلائی سکوں اور ۱۲۷ نقرئی سکوں کے نام درج ہیں تاکہ ان سکوں کی قدر و قیمت معلوم رہے اور انگریزی روپے سے مبادلہ کرنے میں سہولت ہو ۔ گویا ۱۶۵ قسم کے طلائی اور نقرئی سکے بخوبی رائج تھے ۔ اور تانبے کے سکے الگ تھے ۔" (معاشیات ہند صـ ۳۱۷)

شہنشاہ اکبر کے زمانے میں سونے کے سکے مندرجہ ذیل وزن کے تھے :

"مہر شاہی جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ تھی ۱۰۲ تولہ سونا ۔ دوسری اشرفی ۹۰ تولے ۔ تیسری اشرفی ۵۰ تولے ۔ چوتھی اشرفی ۲۵ تولے ۔ پانچویں اشرفی ۲۰ تولے ۔ چھٹی اشرفی ۳ تولے ۔ ساتویں اشرفی ۲ تولہ ۔ آٹھویں اشرفی ایک تولہ ۔ نویں اشرفی ۷ اگرین یعنی ۱۱ ماشہ ۔"

(معیشت الہند صـ ۳۱۴)

شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں حسب ذیل سکے تھے :

مہر شاہی جس کا نام نور شاہی تھا ۔ ۱۰۰ تولے ۔ دوسری اشرفی جس کا نام

نورسلطانی تھا۔ ۵ تولے تیسری اشرفی جس کا نام نور دولت تھا۔ ۲ تولے۔ چوتھی اشرفی نور کرم۔ ا تولے۔ پانچویں اشرفی نور مہر ۵ تولے چھٹی اشرفی نور جہانی ایک تولہ۔ ساتویں اشرفی نورانی ۶ ماشے۔ آٹھویں اشرفی رواجی ۳ ماشے۔

مندرجہ بالا تفصیل سونے کے سکوں کی تھی، چاندی کے سکے بھی جہانگیر کے زمانے میں انہیں اوزان کے تھے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

کوکب سعد.. ا تولے۔ کوکب اقبال۔ ۵ تولے۔ کوکب مراد۔ ۲ تولے۔ کوکب بخت۔ ا تولے۔ کوکب سعد ۵ تولے۔ جہانگیری ایک تولہ سلطانی ۶ ماشہ نثاری ۳ ماشہ۔ خیر قبول ۱/۲ ماشہ۔

(ترجمہ تزک جہانگیری صـ۱۸)

اورنگ زیب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے آگرہ اور دہلی کے خزانوں کی پڑتال کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ چھ ماہ تک کئی ہزار نفوس چاندی کے سکے تولنے میں مصروف رہے اور معلوم ہوا کہ خزانۂ شاہی کا صرف ایک کونہ تولا جا سکا ہے۔ اشرفیوں اور جواہرات کی نوبت نہیں آئی اورنگ زیب فوراً اس مہم کو بند کرا کے دکن کی مہم پر چلا گیا۔"

(علم المعیشت صـ۲۵)

بعض تاریخیں بتلاتی ہیں کہ ۱۷۰۳ء میں صرافوں کی دکانوں پر شہر میں اشرفیوں اور روپیوں کے ڈھیر ایسے لگے ہوتے تھے جیسے منڈیوں میں اناج کے ڈھیر ہوتے ہیں۔"

یہی وجہ تھی کہ پیٹر اعظم (پہلا زارِ روس) نے اپنی وصیتوں میں حکومتِ روس کو وصیت کی تھی کہ وہ ہندوستان کو اپنے قبضے میں لاکر وہاں سے سونا چاندی حاصل کرے اور پھر تمام دنیا پر اس کے سرمایہ کے ذریعہ سے حکومت کرے۔ یہاں کی بسنے والی رعایا نہایت خوش حال اور فارغ البال تھی۔ نہایت آرام اور چین سے زندگی بسر کرتی تھی۔ یہاں کا بادشاہ جشن کے دن سال بھر میں دو دفعہ سونے اور چاندی اور قیمتی فلزات میں تولا جاتا تھا۔ اور جو کچھ وزن میں چڑھتا تھا غریب رعایا میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

(نقشِ حیات حصہ اول)

جہانگیر اپنی کتاب (تزکِ جہانگیری) میں لکھتا ہے:

"اوّل میں سونے سے تلا تین من دس سیر چڑھا ہندوستانی حساب سے پھر باقی فلزات اور اقسام خوشبویات اور مکیفات میں بارہ دفعہ تلا۔ اور اسی طرح سال میں دو بار میں اپنا وزن کرتا ہوں کہ ہر بار سونا چاندی اور باقی فلزات (دھاتیں) اور ریشم اور عمدہ کپڑوں میں اور اقسامِ غلہ سے وزن کرتا ہوں۔ اوّل شروع سال شمسی میں۔ دوبار ماہ قمری میں اور نقد اور سامان اپنے تلنے کا الگ تحویل داروں کو دیتا ہوں کہ فقرا اور حاجت مندوں کو تقسیم کر دیں۔"

(دیکھو ترجمہ تزکِ جہانگیری صفحہ ۱۴، ۴۲، ۹۱، ۹۸، ۱۲۶)

روزانہ شام کو جب بادشاہ کی سواری سیر کے لئے ہاتھی پر نکلتی تھی

تو دو توڑے ہزار ہزار اشرفیوں کے ہاتھی پر بادشاہ کے دائیں اور بائیں رکھے جاتے تھے اور وہ راستے میں بادشاہ پر نچھاور کئے جاتے تھے ہر شب میں بادشاہ کے سرہانے ایک توڑا ہزار روپے کا رکھا جاتا تھا اور صبح کو رعایا میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی خیرات اور رعایا پروری بغیر بے شمار دولت کے نہیں ہو سکتی"۔

(نقشِ حیات حصہ اول)

مقریزی کتاب الخطط جلد ثانی ص پر لکھتا ہے:

شہنشاہ محمد تغلق مرحوم سالانہ دو لاکھ جوڑے کپڑوں کے رعایا میں تقسیم کیا کرتا تھا دس ہزار گھوڑے علاوہ فوجیوں کے ہر سال رعایا میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ روزانہ بڑے بڑے حکام میں سے بیس ہزار آدمی شاہی مہمان خانہ میں کھایا کرتے تھے۔ شاہی باورچی خانہ میں روزانہ ڈھائی ہزار گائیں اور دو ہزار بکریاں مہمانوں کے لئے ذبح ہوتی تھیں۔ دو سو علماء ہر روز بادشاہ کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ شہر دہلی میں ستر شفاخانے عام رعایا کے لئے جاری تھے۔ دو ہزار مسافر خانے اور رباطیں مسافروں اور غریب الوطنوں کے لئے بنے ہوئے تھے۔ ایک ہزار مدرسے تھے"۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے حوالجات سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی طور پر ہندوستان کا ماضی درخشندہ و تابندہ تھا۔ مال و دولت اور ثروت و خوش حالی میں دنیا بھر میں مشہور و معروف تھا لیکن انگریز کے منحوس دور میں یہ افلاس و تنگ دستی اور غربت و فلاکت میں اپنی انتہا کو

پہنچ چکا ہے ۔ اب ذرا انگریزی لوٹ کھسوٹ اور غداری و فریب کاری
سے زرکشی کی داستان سنئے اور اندازہ لگائیے کہ وہی ہندوستان جو
کبھی اپنی دولت و ثروت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا آج غربت و افلاس
کے کس درجے پر پہنچ چکا ہے ۔ ہم صرف اجمالی اشارات پر اکتفا کریں گے

برطانوی ہند کا معاشی حال

لارڈ سالسبری ۱۸۸۱ء میں جب کہ وہ وزیر ہند تھا، لکھتا ہے:

"ہندوستان سے اتنی کثیر رقم بھیج دی جاتی ہے اور اس کا نعم البدل کچھ نہیں دیا جاتا، یہ زخم بجائے خود کیا کم ہے لیکن ہندوستان کے بدن پر لگتا ہے تو اور زیادہ گہرا لگتا ہے۔ اگر خون ہی بہانا ہے تو چھری اس حصۂ جسم میں بھونکنا چاہیے جہاں لہو بہت سا یا کافی جمع ہو۔ نہ کہ دیہاتی رقبوں میں جو پہلے سے ہی خون کی قلت کی وجہ سے نحیف و ناتواں ہو رہے ہیں اب وقت ہے کہ ہندوستان کے بدن سے یہ لہو بہنا رک جانا چاہیے۔"

(حکومت خود اختیاری ص۴۵)

سر چارلس ایلیٹ چیف کمشنر آسام ۱۸۸۸ء میں لکھتا ہے:

"میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ کاشت کاروں کی نصف تعداد ایسی ہے جو سال بھر تک نہیں جانتی کہ ایک وقت پیٹ بھر کھانا کسے کہتے ہیں۔"

(حکومت خود اختیاری ص۸۳)

مسٹر اروِن ڈپٹی کمشنر رائے بریلی لکھتے ہیں:

"کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ (شہروں کے باشندے) خوراک کی قلت سے

جو تکلیف اٹھاتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو کسانوں کو برداشت کرنا پڑتی ہے۔ بالخصوص پردہ نشین مسلمان عورتیں اور مفلس شرفار کو جن کا وقت بگڑ گیا ہے، جو شرم سے بھیک تک نہیں مانگ سکتے اور جن کو بھی کبھی جائداد پر گزر کرنا پڑتی ہے۔ نرخ کی گرانی بری طرح ستاتی ہے۔"

(حکومت خود اختیاری ص۸۳)

مسٹر اے اے برسل ممبر پارلیمنٹ ہندوستان کے سفر سے واپس ہو کر ہندوستان کے مزدور پیشہ لوگوں کے متعلق لکھتا ہے:

"یہ لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں"

(حکومت خود اختیاری ص۸۳)

ایک امریکن مشنری کا مقالہ لالہ لاجپت رائے نقل کرتے ہیں:

"جنوبی ہندوستان کے لوگ زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ میں نے ایسے گھر دیکھے ہیں جہاں لوگ مردار گوشت کھا کھا کر رہتے ہیں۔ اور اس زمانہ میں کوئی عام قحط بھی نہیں بتایا جاتا تھا۔"

(حکومت خود اختیاری ص۸۳)

مسٹر ڈبلیو۔ ایس۔ بلنٹ لکھتا ہے:

میں ہندوستانی مالیہ کے اسرار بہترین استادوں سے حاصل کر رہا ہوں اور یہ معلم گورنمنٹ کے سکریٹری اور کمشنر وغیرہ ہیں۔ اس مطالعے سے میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم اسی طرح ملک کو ترقی دیتے رہے تو ایک دن وہ آئے گا کہ ہندوستانی مجبور ہو کر ایک دوسرے کو

کھاتے پھیں گے۔ کیونکہ اپنے ہم جنسوں کے سوا دوسری چیز ہی نہ مل سکے گی۔

(حکومت خود اختیاری صفحہ ۸۳)

مسٹر سیول میریٹ ممبر کونسل نے ۱۸۳۶ء میں لکھا تھا:

"برطانیہ کا دورِ حکومت مہربان اور معقول بتایا جاتا ہے مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہنچ گیا ہے اگر اس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت لوگ خوش حال تھے۔ یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی کو پہنچ گیا ہے"

(حکومت خود اختیاری صفحہ ۲۷ و ۲۸)

مسٹر اے ایرسل ممبر پارلیمنٹ ۱۹۲۸ء میں لکھتا ہے:

(ہندوستان میں دورہ کرتے اور کئی مہینے یہاں کی حالت اپنی آنکھ سے دیکھنے کے بعد) ہندوستان کی آبادی کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جسے اپنی پیدائش سے لے کر اپنی وفات تک کبھی پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا۔ در آنحالیکہ برطانیہ کو حکومت کرتے ہوئے سو برس سے زائد ہو چکے ہیں لیکن جن علاقوں میں برطانوی تعلق بہت زیادہ اور گہرا رہا ہے مثلاً صوبہ جات بمبئی و بنگال ہیں، وہاں صفائی و حفظانِ صحت کا کوئی قابلِ ذکر انتظام موجود نہیں۔ چھپی ہوئی لغاوت سارے ملک میں موجود ہے۔ ۲۰ کروڑ سے زائد آبادی کی تعداد ایسی ہے جسے ساری عمر پیٹ بھر کر چاول بھی نصیب نہیں ہوتے۔

(از اخبار ہمدم لکھنؤ مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۲۸ء

از ڈیلی ہیرالڈ لندن مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۲۸ء)

مسٹر سائمن اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے :

عام آبادی انتہائی افلاس میں ہے ۔

سوشل خدمات مثلاً تعلیم، حفظانِ صحت، صفائی وغیرہ کا صرفہ مغربی معیار سے نہایت گرا ہوا ہے ۔ اور بعض شعبوں میں تو بالکل صفر ہے ۔

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۳۰ء از رپورٹ سائمن کمیشن)

ایچ ایم سینڈ من (مشہور ماہر اقتصادیات)

ہندوستان روز بروز کمزور و ناتوان ہوتا جا رہا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا خون آہستہ آہستہ مگر دن بدن تیزی کے ساتھ نکلا جا رہا ہے ۔

(ایچ سینڈ منس بنیک کرایٹ سی آف انڈیا از مالیات عامہ)

ڈاکٹر روڈر فورڈ (۱۹۲۷ء کے متعلق)

ہر جگہ زندگی کی کش مکش اندوہ ناک ہے ۔

(وی ایچ رت فورٹس ماڈرن انڈیا ص۱۵ از مالیات عامہ)

یہی ڈاکٹر روڈ فورڈ (دیہاتیوں کی تکالیف بیان کرتا ہوا) لکھتا ہے :

"میرے غم و افسوس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ میں برطانوی باشندہ ہونے کی حیثیت سے اُن کی اس جسمانی حالت کا ذمہ دار ہوں جس نے ان کو دھیمے مگر تکلیف دہ طریقے پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہم برطانوی باشندے اُن کی اس حالت کے ذمہ دار ہیں جس نے تخفیف مالیہ اور اجراء نہر کی کوئی اسکیم جاری نہیں کی جس سے قحط کا سدِ باب ہوتا"

(ماڈرن انڈیا از مالیات عامہ

مسٹر ہیڑ فری مین (ممبر پارلی منٹ و صدر کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ)
سنہ ۱۹۳۰ء میں :

برطانیہ عہد و پیمان کے ذریعے ہندوستان کے بھلے کے لئے حکومت کرنے کا پابند ہے لیکن کیا ہم نے اس عہد کی پابندی کی ہے۔ میں نے اوپر جو واقعات اور حقائق بیان کئے ہیں وہ اس سوال کا جواب دیں گے بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان کو ہوم رول مل گیا تو عوام جمہور پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ ایک سو برس کے برطانوی راج سے جو مصیبت ہندوستان پر نازل ہوئی ہے اس سے زیادہ مصیبت ناممکن ہے جو قانون ساز مجلسیں ہم نے قائم کی ہیں ان میں عوام کی نمایندگی نہیں ہوتی اور ہم نے محصول کا بوجھ سب سے زیادہ غریبوں ہی کے دوش بیکسی پر رکھا ہوا ہے سرکاری رپورٹ میں ہندوستان کے متعلق یہ الفاظ ہیں :

قحط ہندوستان کی فاقہ کشی کی منہ بولتی تصویر ہے مسلسل فاقہ کرنے والوں کی تعداد چار کروڑ سے لے کر سات کروڑ تک ہے۔

(مدینہ بجنور۔ مورخہ ۲۵ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء)

(از: انڈین نیوز لندن)

غرضیکہ ہندوستان کا ماضی تو وہ تھا اور حال یہ ہے جس کا اجمالی خاکہ انگریز کی زبانی آپ سن چکے اور مستقبل تو ہمیشہ حال کی پیداوار ہوا کرتا ہے۔ آپ مستقبل کا اندازہ حال سے لگائیے جس مدبر کے سامنے یہ حالات ہوں کیا وہ ان حالات کو دیکھ کر چین سے بیٹھ سکتا ہے جب کہ قوم نیم مردہ حالت کو پہنچ

چکی ہو تو طبیب و حکیم ماہر خاموشی سے اس کی حالت دیکھتا رہے گا۔ اور اس کے علاج کے لئے کوئی ہاتھ پیر نہیں ہلائے گا۔ یہی صورت حال ہندوستان کے علماء و مدبرینِ قوم کو پیش آئی۔ چنانچہ ان میں سرکردہ ہستی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح کی تھی۔ جو ہر وقت بے قرار و بے اطمینان رہتے اور دن رات قوم کی فلاح و بہبود کے متعلق سوچتے رہتے تھے۔ کہ قوم کو اس گردابِ بلا سے کس طرح نجات دلائی جائے اور آخر آپ نے اپنے رفقائے کار اور مخلص مریدین و جاں باز تلامذہ کو اپنا ہم خیال بنا کر اس مصیبت کے مقابلے کے لئے سر بکف ہو کر میدانِ جہاد میں اتر جانے کی تلقین کی اور خود بھی ان کے ساتھ کود پڑے۔ یہی وہ جہادِ اکبر ہے جس کو دنیا **ریشمی خط** کی تحریک کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ہماری بحث کا مرکز درحقیقت یہی تحریک اور اس کے حالات و کوائف ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے سامنے انگریز کے مظالمِ سیاسیہ و مثالبِ اخلاقیہ اور مسالبِ معاشیہ کا پورا نقشہ تھا۔ وہ ان واقعات و حالات میں اتنی مہارت رکھتے تھے کہ انسانی عقل ان کی زبانی یہ واقعات اور اُن کی تفصیلات سن کر دنگ رہ جاتی تھی۔ اور اس ساری مصیبت و تکلیف کا ذمہ دار وہ صرف انگریز کو سمجھتے تھے۔ اور یہ حقیقت تھی کہ یہ سب مصائب انگریز کے لائے ہوئے تھے۔ انگریز نے اس ملک سے وہ وہ غداریاں اور مکاریاں کیں اور اس ملک کی دولت کو اس طرح دونوں ہاتھوں سے لوٹا کہ خدا کی پناہ! اسی لوٹ کھسوٹ کی تفصیل حضرت شیخ الہند رح اپنے مخصوص و عام اجلاسوں میں اس طرح بیان فرماتے تھے کہ انسان یہ سمجھتا تھا گویا

کہ حضرت نے ساری زندگی کسی معاشی و اقتصادی میدان میں گزاری ہے۔ ہم یہاں جو کچھ اجمالی اشارات کر چکے ہیں یا آئندہ اوراق میں کریں گے یہ سب کچھ حضرت کی زبانی سنی ہوئی باتیں ہیں۔ جن کو ہم حضرت کی زبانی بارہا سنتے رہتے تھے۔ آئندہ اوراق میں ذرا اندازہ لگائیے کہ حضرت شیخ الہند کو ان امور میں قدرت نے کتنی کچھ مہارت عطا فرمائی تھی۔ ان کا دماغ ایک پورا کتب خانہ یا لائبریری تھا جس میں سب کچھ موجود تھا۔

آپ ذرا اندازہ لگائیے کہ انگریزی دور اقتدار کی لوٹ کھسوٹ کی مسلسل داستان کس طرح ان کے حافظے میں محفوظ تھی۔ ہم تو یہاں صرف اجمالی اشارات کریں گے ورنہ تفصیلات کے لئے تو مجلدات درکار ہیں۔

(نقش حیات حصہ دوم)

کسی ملک کی ترقی کا باعث تین چیزیں ہوتی ہیں:
ملکی زراعتی پیداوار۔ صنعتی مصنوعات کی کثرت۔ مال و دولت یعنی سونا اور چاندی کی کثرت۔

ہندوستان ان تینوں شعبوں میں اپنا نظیر آپ تھا اور کہیں اس کی نظیر ملنی مشکل تھی۔ انگریز کے دور حکومت میں یہ تینوں شعبے تباہ و برباد کر دیئے گئے جس کے باعث ہندوستان مفلسوں اور کنگالوں کا ملک بن گیا۔ اس سے پہلے حال یہ تھا کہ ہندوستان کی مصنوعات دنیا بھر میں

برآمد کی جاتی تھیں ۔ چنانچہ اشیائے ذیل لاتعداد اور بے شمار مقدار میں برآمد ہوتی تھیں :

سوت اور روئی ۔ موٹا سوتی کپڑا ۔ دھاگا باریک اور موٹا ۔ ریشمی کپڑا ہر قسم کا ۔ تیل ہر قسم کا مثلاً سرسوں ناریل بنولہ وغیرہ ۔ ہیرے جواہرات ٹسری کپڑا ۔ نیل شکر ۔ لاکھ ۔ سرکہ ۔ ادرک گھی ۔ شورہ ۔ افیون مرچیں موم ۔ نمک ۔ کاغذ ۔ چمڑے کی مصنوعات ۔ سوتی قالین ۔ اونی قالین ۔ شیشے کے ظروف و آلات ۔ لوہے کے اوزار و اسلحہ ۔

مندرجہ بالا ۲۴ موٹی موٹی چیزیں تھیں جو کہ ہندوستان دوسرے ملکوں کو برآمد کرتا تھا ۔ مثلاً چین ، برما ، جاوا ، سماترا ، جاپان ، کابل ، ایران ، عراق عرب ، ٹرکی اور یورپی ممالک ۔ ان ملکوں میں ہندوستان کی مصنوعات کی بڑی قدر ہوتی تھی ۔ اور ہندوستان کی دولت میں ان کی آمدنی سے اضافہ ہوتا رہتا تھا ۔ جو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا تھا ۔

دوسری چیز ملک کی زرعی پیداوار ہے اس کا حال یہ تھا کہ مسلمان حکومتوں کے زمانے میں ہندوستان زراعت پیشہ ملک نہ تھا بلکہ یہاں صرف ۴۰ فیصد آبادی زراعت پر گزارا کرتی تھی ۔ اور زمین چونکہ وافر ہوتی تھی ہر مزارع اور کسان کے پاس فالتو رقبہ جات موجود رہتے تھے ۔ وہ ایک حصے میں کاشت کرتے تھے اور دوسرے فالتو حصے کو ویسے رہنے دیتے تھے جس کی قوت کاشت بڑھ جاتی تھی ۔ پھر دو تین سال اس میں کاشت کرتے اور پہلے حصے کو بغیر کاشت چھوڑ دیتے ۔ یوں زمینوں کی

قوتِ پیداوار بڑھتی رہتی تھی لیکن انگریز کے دور میں جب کہ صنعت و تجارت تباہ ہوگئی تو لوگ زیادہ سے زیادہ کاشت کاری اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے اور ۸۰ فیصد آبادی کاشت کار اور زراعت پیشہ ہوگئی۔ اب ہر سال بلکہ ایک ایک سال میں تین تین چار چار دفعہ ایک ہی حصے میں کاشت ہونے لگی جس سے نہ زمین کی پیداوار کم ہوگئی اور ملک کی زرعی اجناس کی پیداوار میں نمایاں کمی ہوتی چلی گئی۔ جس سے ملک کی آمدنی کو بھی دھکا پہنچا اور جو تھوڑا بہت غلہ پیدا ہوتا تھا وہ انگلستان کو برآمد کر دیا جاتا جس کے سبب یہاں فاقوں پر فاقے اور قحط پر قحط پڑنے لگے۔ جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی تیسری چیز ملک کا سونا اور چاندی ہے اس کی آمد تو دوسرے ملکوں سے صنعت و تجارت کی تباہی سے رک گئی اور ملک کا جو تھوڑا بہت خزانہ تھا وہ انگریز لوٹ کر لے گئے جس سے ملک کنگال و مفلس ہوتا چلا گیا۔ اور ہندوستانیوں کی فاقہ مستی میں دن بدن ترقی ہوتی چلی گئی۔ پہلے جس ملک میں سونا اور چاندی سیروں اور منوں سے تولا جاتا تھا اب تولوں، ماشوں اور رتیوں سے تولا جانے لگا۔ اور پہلے جہاں سونے اور چاندی سے انسان تولے جاتے تھے اب اسی ملک میں سونے و چاندی کی صورت دیکھنے کے لوگ مشتاق ہوگئے۔ آج اس کی صورت بھی دکھائی نہیں دیتی۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ عظیم انقلاب کیوں ہوا۔ اور ملک اتنے عروج سے گر کر اتنے انحطاط و تنزل کے عمیق گڑھوں میں کیوں جا گرا، یہی وہ چیز تھی جس کے سوچنے سے ملک کا بیدار مغز طبقہ چونک اٹھا اور ان کے

دلوں میں انگریز قوم کی نفرت کے جذبات ابھرتے لگے اور قوم کا یہ حالِ زار دیکھ دیکھ کر اُن کے دلوں میں بے قراری و بے اطمینانی موجزن ہونی شروع ہو گئی۔ اُن کا آرام و چین رخصت ہو گیا اور وہ رات دن ہر لمحہ و ہر آن مضطر اور پریشان نظر آتے لگے۔ کیونکہ ان کے سامنے قوم کی تڑپتی لاشیں تھیں جو کہ فاقوں اور بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے رہے تھے۔ یہی وہ انقلاب ہے جس کو ہم یہاں اشارۃً سمجھانا چاہتے ہیں۔ اور اس کی تفصیلات کو قارئین کے نظر و تدبر کے حوالے کرتے ہیں۔ غرضیکہ ہندوستان جو پہلے سب ملکوں سے زیادہ متمول و خوشحال تھا وہی ہندوستان آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ مفلس کیوں ہو گیا!

انگریزی لوٹ کھسوٹ کی داستان

ہندوستان کی معاشیات پر یہ حیرت انگیز انقلاب کیوں آیا؟ صرف انگریز کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے جس کو ہم اجمالی طور پر یہاں پیش کرتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جس سے لوٹ کھسوٹ کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہم اس کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا دور خالص تاجرانہ دوسرا نیم تاجرانہ اور نیم حاکمانہ۔ تیسرا خالص حاکمانہ۔ پہلا سنہ ۱۶۰۰ء سے سنہ ۱۷۵۷ء تک۔ دوسرا سنہ ۱۷۵۷ء سے سنہ ۱۸۳۲ء تک۔ تیسرا سنہ ۱۸۳۲ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک

کمپنی کا پہلا دور

پہلے دور کی اجمالی کیفیت سُنئے:

سنہ ۱۶۰۰ء سے ملکہ الزبتھ کے حکم سے کمپنی بعہد شہنشاہ جہانگیر ہندوستان میں اپنی تجارت کی جس سرمایہ سے ابتدا کرتی ہے وہ صرف تیس ہزار پونڈ تھا۔ سنہ ۱۶۱۲ء میں حکومت کمپنی سے دس ہزار پونڈ قرضہ مانگتی ہے لیکن کمپنی سے یہ سرمایہ جمع نہیں ہوتا۔

۱۶۱۳ء کمپنی حکومت برطانیہ کو تیرہ ہزار پونڈ نذرانہ دیتی ہے۔

۱۶۶۲ء ۴۰ ہزار پونڈ حکومت کو نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۶۶۳ء ۶۰ ہزار پونڈ نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۶۶۷ء ۴ لاکھ پونڈ نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۷۰۰ء کمپنی حکومت کو دس لاکھ پونڈ نذرانہ پیش کرتی ہے جس کے صلے میں حکومت ہالینڈیوں، پرتگیزیوں، فرانسیسیوں اور جرمنوں کو ہندوستان کی تجارت سے روک کر صرف کمپنی کو اجارہ دے دیتی ہے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ جس کمپنی نے حکومت کو یہ نذر اتنے پیش کئے اس نے خود کیا کچھ کمایا ہوگا! یہ کمپنی والے ہی جانتے ہیں جس کو ہمیشہ انھوں نے صیغۂ راز میں رکھا ہے۔

کمپنی کا دوسرا دور

۱۷۵۷ء سے کمپنی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جو حاکمانہ بھی ہے اور تاجرانہ بھی۔ اس میں کمپنی نے جو لوٹ کھسوٹ کی اس کے اجمالی اشارات یہ ہیں:

سیاسی جوڑ توڑ یعنی کسی ایک حاکم کو برخاست کر کے دوسرے کو اسی جگہ کرسئ اقتدار پر بٹھا کر ڈائرکٹران کمپنی نے سیاسی رشوتیں لینی شروع کر دیں۔ اس کے لئے نقشہ ذیل ملاحظہ ہو:

۱۷۵۷ء میر جعفر کی تخت نشینی پر تین کروڑ اکسٹھ لاکھ سات ہزار پانچسو روپے۔

۱۷۶۰ء میر قاسم کی تخت نشینی پر چھبیس لاکھ ۲۷ ہزار چھ سو نوے روپے۔

۱۷۶۳ء میر جعفر کی دوسری تخت نشینی پر چودہ کروڑ ۱۰ لاکھ ۴ ہزار ۹ سو ۱۰ روپے۔

۱۷۶۵ء نجم الدولہ کی تخت نشینی پر ۱۹ لاکھ ۷۰ ہزار ۹ سو روپے۔

۱۷۶۶ء میر جعفر سے ایک خصوصی جوڑ توڑ میں ۳۰ لاکھ روپیہ مسٹر کلایو کو نذر دی گئی۔

۱۷۶۶ء میر جعفر سے کلکتہ کا جنوبی علاقہ جاگیر میں حاصل کیا گیا جس کی آمدنی دس لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔

۱۷۶۶ء چھ لاکھ روپیہ کونسل کے ممبروں کو نذرانہ پیش کیا گیا۔

۱۷۷۱ء ۲۹ کروڑ پچاس لاکھ روپیہ ڈائرکٹران کمپنی کو اسی جوڑ توڑ سے نذرانہ وصول ہوا۔

۱۷۷۵ء میں مسٹر برک نے وارن ہسٹنگز پر مقدمہ چلایا کہ اس نے ۴ کروڑ روپے بطور رشوت حاصل کئے ہیں۔

(۲) سرکاری طور پر

(یعنی ان لڑائیوں میں سرکار کمپنی کو جو مال غنیمت حاصل ہوا وہ اُن مذکورہ بالا اعداد و شمار کے علاوہ ہے۔ نقشہ ذیل ملاحظہ ہو)

۱۷۵۷ء لارڈ میکالے لکھتا ہے استی لاکھ روپیہ مرشد آباد سے کلکتہ روانہ کیا گیا۔

۱۷۶۰ء لارڈ کلایو کہتا ہے کہ تین کروڑ الشالوں کو لوٹ کر کلکتہ میں عظیم دولت جمع کی گئی۔

۱۷۶۲ء بروکس اڈیلسین کا بیان ہے کہ کروڑوں آدمیوں کو لوٹ کر انگریزوں نے دولت سے لندن کو مالا مال کر دیا۔

یہی وہ دور ہے جب انگلستان اپنی نئی نئی ایجادیں ترقی کر رہا تھا۔ یہ ترقی ہندوستان کی دولت کے بل بوتے پر تھی۔

(۳) تجارت

(تجارت کے ذریعے اس دور میں کمپنی نے جو کچھ وصول کیا اس کا اندازہ کرنے کے لئے نقشہ ذیل ملاحظہ ہو)

۱۷۵۸ء میں کمپنی نے حکومت برطانیہ کو بطور نذرانہ اسی لاکھ پونڈ پیش کیا۔

۱۷۶۰ء ایک کروڑ پونڈ نذرانہ پیش کیا گیا۔

۱۷۶۳ء ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ پیش کیا گیا۔

۱۷۶۷ء چار کروڑ پونڈ پیش کیا گیا۔

اس سے آپ کمپنی کی آمدنی کا اندازہ لگالیں۔ پھر اسی دور میں کمپنی نے فرخ سیر سے اپنے ٹیکس بھی معاف کرالئے۔ اب تو کمپنی نے ہندوستانی تاجروں کو بالکل ہی بے دست و پا کر دیا۔

(۴) ملازمین کمپنی کی پرائیویٹ لوٹ کھسوٹ

اس دور میں ملازمین کمپنی نے بطور رشوت مالِ غنیمت اور دوسرے

طریقِ جبر و تشدد سے جو کچھ وصول کیا وہ ان مذکورہ بالا اعداد و شمار کے علاوہ ہے۔ لارڈ کلائیو کہتا ہے کہ اس قدر بدعملی، رشوت خوری اور زیادہ ستانی کا منظر بجز بنگال کے کہیں نہیں دیکھا گیا۔

لارڈ میکالے کہتا ہے کہ ہر انگریز کے گھر میں دولت کے آثار دکھائی دینے لگے۔ بروکس اڈیسن کہتا ہے کہ بطور لوٹ کھسوٹ کے جو کچھ ہندوستان سے انگلستان پہنچایا گیا وہ کروڑوں اشرفیاں ہو گئیں۔

نتیجہ

سنہ ۱۷۶۰ء سے انگلستان میں ایجادات اور صنعت و حرفت کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔

بروکس ایڈیسن اپنی کتاب "قانون تمدن و تنزل" میں لکھتا ہے کہ سنہ ۱۷۵۰ء میں جب میں انگلستان آیا تھا تو یہاں بڑے بڑے شہر تھے، نہ کوئی بینک تھا نہ کوئی کارخانہ۔ بنگال کی چاندی نے انگلستان پہنچ کر نہ صرف دولت میں بے شمار اضافہ کیا بلکہ اس کی رفتار بھی بہت تیز کر دی۔

سر ولیم ڈگبی لکھتا ہے کہ معرکۂ پلاسی کے بعد ہی بنگالہ کی دولت لٹ لٹ کر لندن پہنچنے لگی۔ اور اس کا اثر فوراً ہی ظاہر ہو گیا کہ یہاں سنہ ۱۷۶۰ء سے پہلے کوئی کارخانہ نہ تھا لیکن اب بڑے بڑے کارخانے نظر آنے لگے۔

نبیر لکھتا ہے کہ سنہ ۱۷۶۰ء سے پہلے لنکا شائر میں سوت کاتنے کے جو چرخے رائج تھے وہ ایسے سیدھے سادے ہوتے تھے کہ ہندوستانی

چرخوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جنگِ پلاسی کے بعد جب کہ سونے کا دریا انگلستان کی طرف بہنا شروع ہوا تو لنکا شائر نہ صرف ہندوستانی چرخوں پر بلکہ ان کی دستی صناعی پر بھی فوقیت لے گیا۔ کیونکہ ایجاد بجائے خود ایک بے جان چیز ہے جب تک اس کو حرکت دینے کی قوت پیدا نہ ہو اور وہ قوت ہے دولت۔

میجر وینگیٹ کہتا ہے کہ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۳۲ء تک کے درمیانی دَور میں انگلستان کو ہندوستان سے پندرہ ارب روپیہ جا چکا ہے۔ جس نے وہاں کی صنعتوں میں جان ڈال دی۔

کمپنی کا تیسرا دور

یہ دور کمپنی کے مکمل تسلط کا دور ہے۔ اس میں کمپنی ایک طرف ہندوستان کی بادشاہ ہے اور دوسری طرف تاجر بھی۔ ۱۸۲۳ء اسی زمانے کے متعلق سر ولیم ڈگبی کہتے ہیں:

"آج ہندوستان اس سے زیادہ شرم ناک طور پر لوٹا جا رہا ہے جتنا کہ اس سے پہلے کبھی لوٹا گیا تھا۔"

۱۸۳۸ء مسٹر منٹگمری مارٹن لکھتا ہے کہ اگر دولت کا ایسا مسلسل اور روز افزوں سیلاب انگلستان سے ہونے لگے تو وہ بھی ایک دن محتاج ہو جائے پھر خیال فرمائیے کہ ہندوستان پر کتنا سخت اثر ہونا چاہیئے۔

۱۸۲۳ء سر جان شور وائسرائے ہند کہتا ہے: ہمارے طرز حکومت کے تحت ملک اور باشندگانِ ملک رفتہ رفتہ محتاج سے محتاج تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

۱۸۸۲ء مسٹر اے۔ جی۔ ولسن اپنے ایک آرٹیکل میں کہتا ہے کہ اے بدقسمت ملک ہندوستان تجھ سے ہر سال پورے تین کروڑ پونڈ انگلستان کھینچ لیتا ہے۔

مندرجہ بالا حوالہ جات سے مقصد یہ ہے اس زمانے کی شرمناک لوٹ

کھسوٹ کی طرف اشارہ کرنا۔ نقشۂ ذیل ملاحظہ ہو:

سنہ ۱۹۰۰ء سر ولیم ڈگبی نے آئینی طور پر ہندوستان سے جانے والی دولت کا تخمینہ لگایا ہے جس کی مقدار اکیانوے ارب بیس کروڑ ہے۔

سنہ ۱۹۴۶ء مسٹر ہنڈومن کے تخمینہ کے مطابق سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۴۶ء تک ۲۷ ارب ۶۰ کروڑ روپئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا سنہ ۱۸۳۲ء سے سنہ ۱۹۴۵ء تک آئینی طریقوں پر ہندوستان سے نکلنے والی دولت کا اندازہ ایک کھرب ۱۸ ارب اسی کروڑ روپیہ ہوتے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۶ء وٹھل بھائی پٹیل نے ان اعداد و شمار کی تردید کرتے ہوئے صحیح تخمینہ پیش کیا ہے جس کا اندازہ ۴ کھرب ۵۰ ارب روپیہ ہوتے ہیں۔

غیر آئینی طریقوں سے جو کچھ ہندوستان سے بذریعہ تجارت یا دوسری ملعونہ پالیسیوں کے تحت لوٹ کھسوٹ کے طور پر ہندوستان سے انگلستان کو دولت گئی اس کا کوئی حساب کتاب نہیں طرفہ تماشا یہ ہے کہ ایک طرف ہندوستان کو لوٹا جا رہا ہے اور دوسری طرف ہندوستان کے قومی قرضے میں اضافہ کیا جاتا ہے جس سے ہر سال حکومتِ برطانیہ اسی کروڑ روپیہ بطور سود کے حکومتِ ہند سے وصول کر لیتی ہے۔ ان قرضوں کی نوعیت بھی عجیب ہے۔ سنہ ۱۸۵۸ء میں حکومتِ برطانیہ ہندوستان کو کمپنی کے ہاتھوں سے خرید لیتی ہے اور جو کچھ کمپنی کو رقم ادا کی جاتی ہے وہ ہندوستان کے قومی خزانے پر بطور قرضہ ڈال دی جاتی ہے۔ اور یہ

قرضہ دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ انگریز دنیا میں جہاں کہیں بھی لڑائی لڑتا ہے اس کے مصارف بھی اسی قرضے میں ڈالے جاتے ہیں۔ یہ قرضہ درحقیقت کمپنی کے دور سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے لئے نقشہ ذیل ملاحظہ ہو:

سنہ ١٧٩٢ء	مقدار قرضہ	ستر لاکھ پونڈ
سنہ ١٧٩٩ء	"	ایک کروڑ پونڈ
سنہ ١٨٠٥ء	"	دو کروڑ دس لاکھ پونڈ
سنہ ١٨٢٩ء	"	تین کروڑ پونڈ
سنہ ١٨٣٦ء	"	تین کروڑ تیس لاکھ پونڈ
سنہ ١٨٣٩ء	"	چار کروڑ ٣٥ لاکھ پونڈ
سنہ ١٨٥٠ء	"	٥ کروڑ ٥٠ لاکھ پونڈ
سنہ ١٨٥٧ء	"	٦ کروڑ ٥٠ لاکھ پونڈ
سنہ ١٨٥٩ء	"	٦ کروڑ ٩٥ لاکھ پونڈ
سنہ ١٨٦٠ء	"	١٠ کروڑ پونڈ
سنہ ١٩١٤ء	"	٣٠ کروڑ ٧٠ لاکھ پونڈ
سنہ ١٩٢٣ء	"	٤٨ کروڑ ٥٨ لاکھ ٣٠ ہزار پونڈ
سنہ ١٩٢٥ء	"	٥١ کروڑ ٧١ لاکھ ٨٠ ہزار پونڈ
سنہ ١٩٢٨ء	"	ایک ارب پونڈ

(ماخوذ از حکومت خود اختیاری صفحہ ١٨١)

اب ہم حکومت کے لوٹ کھسوٹ کے طریقوں کو تین حصوں میں منقسم کرتے

ہیں ۔ پہلا حصہ حکومتی ذرائع ۔ دوسرا حصہ صنعتی ذرائع ۔ تیسرا حصہ تجارتی ذرائع ۔

حکومتی ذرائع سے ہندوستان کو ہر طرح مفلس اور تنگدست کیا گیا ۔ چنانچہ انسانوں پر ٹیکس ، تجارت پر ٹیکس اور زمین کا لگان ہر ایک چیز کو حکومت نے دگنا چوگنا کر دیا ۔ جو ٹیکس عائد کئے گئے ان کے لئے نقشۂ ذیل ملاحظہ ہو :

سنہ ۱۸۷۱ء	فی کس	ایک روپیہ		تیرہ آنہ		۹ پائی	
سنہ ۱۸۸۱ء	〃	۲	〃	۲	〃	۱۱	〃
سنہ ۱۸۹۱ء	〃	۲	〃	۳	〃	۱۱	〃
سنہ ۱۹۱۰ء	〃	۲	〃	۱۰	〃	۲	〃
سنہ ۱۹۱۱ء	〃	۲	〃	۱۳	〃	۱۱	〃
سنہ ۱۹۱۳ء	〃	۳	〃	۱	〃	۹	〃
سنہ ۱۹۲۰ء	〃	۵	〃	۱۱	〃		
سنہ ۱۹۲۲ء	〃	۶	〃	۷	〃		
سنہ ۱۹۲۳ء	〃	۷	〃				

(ماخوذ از اخبار وکیل امرتسر ۲۳ ۔ نومبر ۱۹۲۳ء)

حالانکہ مغلیہ دور میں انسانوں پر کوئی ٹیکس نہیں تھا ۔

لگان مغلیہ دور میں آمدنی کا چوتھا حصہ حکومت بطور لگان وصول کرتی تھی ۔ اگر پیداوار کم ہوتی تو حکومت ، زمیندار اور کاشت کار

سب نقصان میں شریک ہوتے اور اگر پیداوار زیادہ ہوتی تو سب کا منافع ہوتا لیکن حکومت برطانیہ نے اس طریقے کو منسوخ کر کے نیا طریقہ لگان کا جاری کیا۔ وہ یہ کہ فی ایکڑ کے حساب سے حکومت لگان وصول کر لیتی تھی۔ خواہ وہ پیداوار کا سو فی صدی ہی کیوں نہ ہو جائے۔ حکومت پیداوار پر پانچ فی صدی سے پچھتر اور سو فی صدی تک وصول کر لیتی ہے جس سے زمیندار اور کاشتکار دونوں کی حالت ابتر ہوتی گئی اور حکومت کی آمدنی میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے لئے ذیل کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے:

نام صوبہ	مغلیہ دور	برطانوی دور
بنگال	۸۱۷۵۵۲۰ روپئے سالانہ	۲۶۸۰۰۰۰۰ روپئے سالانہ
ممالک متحدہ آگرہ و اودھ	۱۳۵۱۳۴۷۰ ,, ,,	۱۶۸۲۳۰۹۰ ,, ,,
بہار اشتر	۸۰۰۰۰۰۰ ,, ,,	۱۵۰۰۰۰۰۰ ,, ,,

اور اس لگان میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ملاحظہ فرمائیے:

سنہ ۱۸۲۲ء میں ۱۵۰۰۰۰۰۰ روپئے
سنہ ۱۸۵۶ء میں ۱۷۳۰۰۰۰۰ ,,
سنہ ۱۸۷۰ء میں ۱۹۹۶۰۰۰۰ ,,
سنہ ۱۸۷۵ء میں ۲۴۶۰۰۰۰۰ ,,
سنہ ۱۸۸۰ء میں ۲۵۹۱۰۰۰۰ ,,
سنہ ۱۸۹۰ء میں ۲۶۵۰۰۰۰۰ ,,

سنہ ۱۹۰۰ء میں ......۲۶۲۵ روپئے

سنہ ۱۹۱۴ء میں ......۳۱۲۵ "

اس کے علاوہ ہندوستانی صنعت کاروں پر بھی محصول لگایا گیا کہ انگلستان کے بنے ہوئے مال کا محصول درآمد جتنا ہے اتنا ہی محصول ہندوستانی صنعت کار بھی ادا کریں۔ چنانچہ ساڑھے تین فیصدی انگلستانی مصنوعات پر محصول درآمد تھا تو ساڑھے تین فی صدی محصول ملکی مصنوعات پر بھی لگا دیا گیا۔ دُنیا کے کسی قانون میں بھی اس طرح کا محصول نہیں مگر برطانوی حکومت یہاں یہ محصول آخر تک لیتی رہی۔ یہ تو سنہ ۱۸۹۶ء کا واقعہ ہے جب لارڈ ایلجن نے ایک ایکٹ کے ذریعے یہ محصول عائد کیا۔ لیکن اس کے بعد سنہ ۱۹۱۷ء میں بکری ٹیکس اور منافع ٹیکس کا اس پر اضافہ کیا گیا۔ خلاصہ کلام یہ کہ برطانوی حکومت نے ٹیکسوں، لگانوں اور محصولوں کے ذریعے سے ہندوستان کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کیا۔

(۲) صنعتی ذرائع سے لوٹ کھسوٹ

ہندوستان اپنی صنعت و حرفت میں قدیم زمانہ سے دُنیا بھر میں مشہور تھا۔

مسٹر تھارنٹن اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ: "یورپ کو تہذیب سکھانے والے یونان اور اٹلی جب کہ بالکل جنگلی حالت میں تھے تو ہندوستان اس زمانہ میں بھی صنعت و حرفت، کاروبار اور تجارت میں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا"۔

(رسالہ مظلوم کسان صـ۱۳)

مسٹر میریڈیتھ ٹاؤنسنٹ اپنی کتاب ایشیا اور یورپ میں لکھتا ہے کہ ہماری حکومت سے پہلے ہندوستانی پُر لطف زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ اور ان کے ہر کاروبار میں بڑی آسانیاں تھیں۔

(رسالہ تلک صاحب صـ۱۱)

ڈاکٹر فرانسس اپنی کتاب میں لکھتا ہے: یہ خیال غلط ہے کہ سارے ہندوستان کا عام پیشہ زراعت ہے بلکہ ہندوستان کی صنعتیں پارچہ بافی اور اسی طرح دوسری صنعتیں عروج پر رہی ہیں۔

(علم المعیشت صـ۵۸)

لارڈ ویلزلی گورنر جنرل اپنے ایک مراسلے میں کمپنی کے ڈائریکٹروں کو تحریر فرماتے ہیں کہ "کلکتہ کی بندرگاہ میں دس ہزار ٹن کے قریب جہاز موجود ہیں جو ہندوستان ہی میں تیار ہوئے ہیں"

ٹیلر صاحب کا بیان ہے کہ ہندوستان کا مال لے کر جب ہندوستانی جہاز لندن کی بندرگاہ میں پہنچے تو وہاں سنسنی پیدا ہو گئی گویا خدانخواستہ دریائے ٹیمز میں کسی غنیم کا جنگی بیڑہ گھس آیا ہے۔ لندن کے جہاز سازوں نے شور مچادیا کہ اُن کا کاروبار تباہ ہوا جاتا ہے اور انگلستان میں تمام جہاز سازوں کے خاندان بھوکوں مر جائیں گے۔ لہٰذا ہندوستانی جہازوں کو یہاں نہ آنے دیا جائے۔ بلکہ ہندوستان کے جہاز راں بھی ملازم نہ رکھے جائیں کیونکہ وہ یہاں آکر ہماری حالت دیکھتے ہیں تو اُن کے دلوں میں ہماری وقعت کم ہو جاتی ہے

جو حکمرانی کے لئے لازم ہے۔ آخر حکومت نے یہ قانون پاس کر دیا۔

(معیشت الہند ص ۶۹۸)

سر ولیم ڈگبی کہتے ہیں کہ ۱۸۰۰ء میں گورنر جنرل نے رپورٹ لکھی ہے کہ کلکتہ کی بندرگاہ میں دس ہزار ٹنّے جہاز موجود ہیں جو اس جگہ بنائے گئے ہیں۔

(کتاب پراسپرس برٹش انڈیا صفحہ ۹۰۸)

لیفٹننٹ کرنل اے واکر ۱۸۸۱ء میں اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے کہ یورپ کا تیار شدہ جہاز صرف بارہ سال چل سکتا ہے لیکن بمبئی کا ساگوان کا بنا ہوا جہاز پچاس سال سے بھی زیادہ چل سکتا ہے۔

سر ولیم ڈگبی نے لکھا ہے کہ یورپ کا جہاز ناپائیدار بھی ہوتا ہے اور اس پر لاگت بھی زیادہ آتی ہے۔ اور دیر میں تیار ہوتا ہے۔ اس کی بہ نسبت ہندوستان کا تیار کیا ہوا جہاز پائیدار ہوتا ہے، لاگت کم آتی ہے اور کم مدت میں تیار ہوتا ہے۔ موازنہ حسب ذیل ہے:

بمبئی

تعداد جہاز	مدت تعمیر	خرچہ تعمیر
۲ عدد فوجی بحری جہاز	۱۸ ماہ	۷۵ پونڈ
۴ عدد بحری جہاز	تین برس	۱۵۰ پونڈ
۲۰ " "	۱۵ برس	۷۵۰ پونڈ
(یعنی ایک بیڑہ)		

انگلینڈ

تعداد جہاز	خرچہ تعمیر
۲ عدد فوجی بحری جہاز	۱۰۰ پونڈ
۴ عدد بحری جہاز	۳۰۰ پونڈ
۲۰ " "	۱۰۰۰ پونڈ

مسٹر راناڈے ۱۸۸۲ء میں لکھتا ہے کہ دہلی کی مشہور لوہے کی لاٹھ جو پندرہ سو سال پرانی ہے اس سے لوہا ڈھالنے کی صنعت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ان حوالہ جات سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ آج جو یہ مشہور کیا جاتا ہے کہ ہندوستان زراعت پیشہ ملک ہے یہ سراسر غلط ہے، ہندوستان ہمیشہ صنعت و حرفت اور تجارت میں دنیا میں مشہور رہا ہے مگر انگریز کی ملعونہ پالیسی نے اس کی صنعت و حرفت کو تباہ کر دیا۔ اور اس کے باشندوں کو زراعت پر مجبور کر دیا۔ ذیل کے حوالہ جات کو ملاحظہ فرمائیے:

۱۷۶۹ء ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اپنے اعلیٰ عہدہ داروں کو حکم بھیجا کہ ہندوستان میں خام ریشم کی پیداوار بڑھانے کی کوشش کی جائے اور ریشمی کپڑوں کی تیاری گھٹائی جائے بلکہ بالکل بند کر دی جائے۔ اور کپڑا بننے والوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ کمپنی کے کارخانوں میں کام کریں۔

۱۷۸۳ء انگلستان کے دار العوام میں ایک منتخبہ کمیٹی ہندوستان کے

حالات پر غور کرنے کے لئے بھیجی۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اب یہاں خام ریشم کی پیداوار میں ترقی ہو رہی ہے۔ اور ریشم بننے والے اب کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے لگے ہیں۔ ہماری سفارش ہے کہ اگر وہ بطور خود ریشم بننے کا کام کریں تو ان کو روکا جائے اور اگر نہ مانیں تو سخت سزا دی جائے۔

۱۸۱۳ء سر تھامس منرو پارلیمنٹ کی منتخبہ کمیٹی کے سامنے کہتا ہے۔ اور ملازمان کمپنی کی کارگزاری کی تعریف کرتا ہے کہ انھوں نے نوربافوں کو اپنے کارخانوں میں کام کرنے کے لئے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ اس کی تائید میں خاص واقعہ پیش کرتا ہوں کہ ایک دن ملازمان کمپنی نے نوربافوں کی ایک ٹولی کو بارہ محل نامی مکان میں بند کر دیا اور ان پر پہرہ بٹھا دیا اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک کہ انھوں نے یہ معاہدہ نہ کیا کہ وہ اپنا مال سوائے کمپنی کے کسی اور کے ہاتھ فروخت نہ کریں گے۔ اس کے بعد اگر کوئی نورباف معاہدہ کی پوری پابندی نہیں کرتا تو اس پر ایک شحنہ تعینات کر دیا جاتا ہے جس کا طلبانہ ایک آنہ روز اسی نورباف سے وصول کیا جاتا ہے۔ شحنہ کے پاس ایک سونٹا ہوتا ہے جس سے وہ بلا تکلف تنبیہ الغافلین کا کام لیتا ہے۔

۱۷۹۳ء مسٹر کاکس کا بیان ہے کہ ہندوستانی زمینداروں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ کمپنی کے تجارتی افسروں کو اپنے معاملات میں نہ روکیں اور اُن سے ادب سے پیش آئیں۔

۱۸۱۱ء تجارتی بورڈ کی ڈائری میں درج ہے کہ ان غریب کپڑا بننے والوں اور ملک کے دوسرے کاریگروں کو سخت سے سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔

جرمانے ہوتے ہیں، قید ہوتے ہیں اور کوڑے پڑتے ہیں۔ جس کے باعث اب کاریگروں کی تعداد بہت کم ہوتی جاتی ہے۔ غرضیکہ اسی طرح کے ظلم و تشدد اور جبر و تعدی سے ہندوستانی صناعوں کو صنعت چھوڑنے پر مجبور کیا۔ کہ وہ یا تو انگریزی کارخانوں میں کام کریں تاکہ بعد میں کسی دوسرے کام کے نہ رہیں یا زراعت کا پیشہ اختیار کریں تاکہ انگلستان کے لئے خام مال کی پیداوار بڑھے۔

اس کے علاوہ انگریز نے اٹھارھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں مامونِ تجارت کا ڈھونگ رچایا۔ کہ ہر کوئی اپنی ملکی مصنوعات کو ترقی دے اور ایک ملک کی مصنوعات دوسرے ملک میں نہ جانے پائیں۔ اس پر کتابیں لکھی گئیں، پمفلٹ اور اشتہارات شائع ہوئے۔ اخباروں میں مقالے چھپنے لگے۔ جلسوں اور مجمعوں میں تقریریں ہونے لگیں۔ مظاہرے اور جلوس شروع ہو گئے۔ غرضیکہ ہر طرح سے مامون کا تجارت کا فلسفہ لوگوں کو سمجھایا جانے لگا۔ اس سے مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستانی مصنوعات کو انگلستان اور دوسرے ممالک میں جانے سے روکا جائے ورنہ اگر یہ نظریہ دیانت پر مبنی ہوتا تو ربع صدی کے بعد جب ہندوستانی صنعت دم توڑ گئی اور ہندوستان کے صنعت کار زراعت اور انگریزی ملازمت پر مجبور ہو گئے تو یہی مامون تجارت کا فلسفہ کیوں بیکار محض ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ آزاد تجارت کا ڈھونگ کیوں رچایا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مامون تجارت کا فلسفہ نہ تھا بلکہ انگریز کی ایک سازش تھی جس کے ذریعے اُس نے ہندوستانی صنعت کو تباہ و برباد کیا۔ چنانچہ مامون تجارت کا قانون انگلستان میں منظور ہو جاتا ہے اور اُن

کی دیکھا دیکھی دوسرے ممالک بھی اسی نظریے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگلستان میں ہندوستان کی مصنوعات کی درآمد دن بدن گھٹتی رہی کیونکہ وہاں ہندوستانی مصنوعات پر بقول مسٹر منٹگمری تگنا اور چوگنا محصول لگایا گیا۔ پہلے دس فیصدی، پھر بیس فیصدی پھر تیس فیصدی پھر پچاس حتیٰ کہ ہوتے ہوتے سو فیصدی تک محصول لگا دیا گیا۔ لیکن اس کے بالمقابل ہندوستان میں انگلستان کی مصنوعات پر صرف ساڑھے تین فیصد محصول رہا۔ جس کے نتیجے میں انگلستان میں ہندوستان کے مال کی درآمد بالکل ختم ہو گئی۔ نقشہ ذیل ملاحظہ ہو:

ہندوستانی مصنوعات	محصول فیصد سنہ ١٨١٢ء	محصول فیصد سنہ ١٨٢٤ء	محصول فیصد سنہ ١٨٣٢ء
ریشمی کپڑے	قطعی ممانعت	قطعی ممانعت	بیس فیصد
زربفت	,,	,,	تیس ,,
شالی چادر	اکھتر فیصد	٦٧ ½ فیصد	,, ,,
چھینٹ	٧١ ½ ,,	,, ,,	١٠ ,,
قالین	٦٨ ½ ,,	٥٠ ,,	٢٠ ,,
بنت کا آرائشی سامان	٧١ ,,	٥٠ ,,	٣٠ ,,
سوتی کپڑا	٢٧ ½ ,,	٥٠ ,,	٢٠ ,,

دوسرا نقشہ ملاحظہ ہو:

نام اشیاء	درآمد در انگلستان	سنہ	قیمت
ململ	٥ لاکھ تھان	سنہ ١٨١٥ء	١٣٠٥٠٤٠٠ روپے
,,	,,	سنہ ١٨٣٢ء	٣٠٠٠٠٠ ,,

ململ	۵ لاکھ تھان	سنہ ۱۸۶۰ء	۸۰۰۰۰ روپے
"	"	سنہ ۱۸۱۳ء	ساڑھے تین لاکھ روپے
"	بالکل بند	سنہ ۱۸۱۷ء	

چنانچہ جب محصولوں کی زیادتی کے باوجود ہندوستان کی صنعت انگلستان کی صنعت کو مات کرتی رہی تو پھر حکومت برطانیہ نے وہاں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد اور استعمال پر سزائیں دینی شروع کر دیں چنانچہ:

سنہ ۱۸۲۰ء میں قانون بنایا گیا کہ جو لوگ ولایت میں ہندوستان کی چھینٹ فروخت کریں گے اُن پر دو سو روپیہ جرمانہ ہوگا۔ اور جو خریدیں گے ان پر پچاس روپے جرمانہ۔

سنہ ۱۸۲۱ء انگلستان میں جو لوگ ہندوستان کا ریشمی کپڑا فروخت کریں گے ان پر پانچسو روپیہ جرمانہ اور جو خریدیں ان پر ایک سو روپیہ جرمانہ۔

سنہ ۱۸۲۲ء میں قانون پاس ہوا کہ مندرجہ ذیل مالوں پر یہ محصول لیا جائے:

نام اشیاء	محصول فیصد
کپاس کا کپڑا	۸۱ فیصد
کپاس	۱۵ روپے فی من
چھینٹ	۸۱ فیصد
تن زیب	۳۲ "
چٹائی	۸۴ "
بکرے کے اون کی اشیاء	۴۱ "

لیکن اسی دور میں یعنی سنہ ۱۸۲۱ء اور سنہ ۱۸۲۲ء میں ہندوستان میں انگریزی مصنوعات پر ۲½ فیصدی محصول لیا جاتا تھا۔ انگریز کی چالاکیاں اور مکاریاں ملاحظہ ہوں کہ جس چیز کی انگلستان کو ضرورت ہے اس پر محصول برائے نام ہے۔ چنانچہ ریشم خام کا نقشہ ذیل ملاحظہ ہو:

سنہ ء	محصول فیصد
سنہ ۱۸۱۳ء	۳ فیصد
سنہ ۱۸۲۳ء	۴ فیصد
سنہ ۱۸۳۲ء	ایک آنہ فی صد

انگریز کی ان چیرہ دستیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی مصنوعات کی برآمد دوسرے ممالک میں بھی دن بدن گھٹنی شروع ہو گئی۔ نقشہ ذیل ملاحظہ ہو:

نام ملک درآمد کنندہ	نام اشیاء درآمد شدہ	سنہ ء	مقدار
انگلستان	سوتی کپڑا	سنہ ۱۸۰۲ء	۱۴۸۱۷ گٹھے
امریکہ	"	سنہ ۱۸۰۱ء	۱۳۶۳۳ "
ڈنمارک	"	سنہ ۱۸۰۰ء	۱۳۵۷ "
پرتگال	"	سنہ ۱۷۹۹ء	۹۷۱۴ "
عرب فارس	"	سنہ ۱۸۱۰ء	۶۰۰ "
انگلستان	"	سنہ ۱۸۲۹ء	۴۳۳ "
امریکہ	"	سنہ ۱۸۲۹ء	۲۵۸ "
ڈنمارک	"	سنہ ۱۸۲۰ء	۱۵۰ "

پرتگال	سوتی کپڑا	سنہ ۱۸۲۵ء	۱۰۰۰ اگھٹے
عرب فارس	"	سنہ ۱۸۲۵ء	۲۰۰۰ "

نتیجہ خلاصۂ کلام یہ کہ حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی صنعت وحرفت کو تباہ وبرباد کیا اور اپنی انگلستان کی صنعت کو ترقی دی جس میں سرمایہ بھی ہندوستانی استعمال ہوتا رہا اور خام مال بھی ہندوستان کا اور اُن کی برآمد بھی ہندوستان میں ہوتی رہی جس سے انگریز نے کروڑوں روپیہ کمایا۔

تجارتی ذرائع سے لوٹ کھسوٹ

پچھلے مضمون میں صنعت وحرفت کی تباہی کے ضمن میں معلوم ہوگیا ہوگا کہ ہندوستان کی تجارت اور کاروبار بھی انگریز کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ اس لیے کہ مصنوعات کی تجارت جب ختم ہوگئی تو ہندوستان کے ہاتھ میں اب صرف خام مال کی تجارت رہی اور اس پر بھی انگریز کی اجارہ داری تھی۔ چنانچہ پچھلے حوالوں میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ انگریز جو مال جس قیمت پر چاہیں جبراً مالک مال سے خریدیں۔ اور اس کی جو قیمت چاہیں زبردستی اس کے حوالے کردیں۔ لیکن اس کے علاوہ بھی انگریز نے ہندوستانیوں کی تجارت کو ہر ممکن طریقے سے ختم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ جب انگلستان میں مصنوعات کے انبار لگنے لگے تو اُن کے نکاس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی تدبیر سوچی تھی چنانچہ

انیسویں صدی کے اوائل میں انگریز نے آزاد تجارت کا ڈھونگ رچانا شروع کر دیا۔ کہ ہر ملک کو اجازت ہونی چاہیئے کہ وہ دوسرے ملک میں آزادی سے اپنی مصنوعات کی نمائش کرے۔ اور ان کو فروخت کرے۔ چنانچہ اسی آزاد تجارت کے فلسفے پر اب اخباروں میں مقالات شائع ہونے لگے۔ پفلٹ کتابیں اور اشتہار چھپنے لگے۔ مجموں اور جلسوں میں تقریریں ہونے لگیں۔ جلوس اور مظاہرے شروع ہو گئے تو بالآخر سنہ ۱۸۱۳ء میں آزاد تجارت کا قانون پاس کر دیا۔ اب دھڑا دھڑ ہندوستان میں انگلستان کی مصنوعات کی آمد شروع ہو گئی۔ اور ان پر برائے نام محصول لگایا گیا۔ ہندوستانی مصنوعات تو پہلے ہی ختم ہو چکی تھیں۔ اس لئے اب شہروں میں، قصبوں میں گاؤں میں ہر جگہ انگریزی مصنوعات کی نمائش ہونے لگی۔ اور دنیا ان کے خریدنے پر مجبور تھی۔ اس لئے دن دونی رات چوگنی انگریزی تجارت میں ترقی ہونے لگی۔ اور آج تک ہو رہی ہے۔ ان معاملات کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعت اور تجارت دن بدن ختم ہو گئی۔ اور لوگ زراعت کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ نقشہ ذیل ملاحظہ ہو:

سنہ	زراعت پیشہ فی صد
سنہ ۱۸۵۰ء	۴۰ فیصد
سنہ ۱۸۹۰ء	۵۰ ”
سنہ ۱۹۱۸ء	۶۱ ”
سنہ ۱۹۱۰ء	۶۶ ”

سنہ ۱۹۱۱ء	۷۱ فیصد
سنہ ۱۹۱۵ء	۷۲ "
سنہ ۱۹۲۲ء	۸۰ "

صنعت کاروں کی مجموعی تعداد

سنہ ۱۹۰۱ء	۱۵۰۵۰۰۰۰
سنہ ۱۹۱۱ء	۱۱۰۱۰۰۰۰
سنہ ۱۹۲۱ء	۱۰۰۳۰۰۰۰
سنہ ۱۹۳۱ء	۹۰۷۰۰۰۰
سنہ ۱۹۴۲ء	۳۱۰۰۰۰۰

چنانچہ اس لوٹ کھسوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک افلاس اور نکبت میں انتہا کو پہنچ گیا۔ ہر چیز گراں سے گراں تر ہوتی گئی۔ اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ چنانچہ جتنی گرانی انگریز کے زمانے میں ہوئی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

نقشہ ذیل ملاحظہ ہو:

اشیاء	قیمت	نام سلطنت	اندازہ مقدار
گیہوں	ایک روپیہ	علاء الدین خلجی	۰ - ۲۹ سیر -- ۲ من
"	۹ آنہ	محمد تغلق	۰ - ۵ - ۱ "
"	۵½ آنہ	فیروز تغلق	۰ - - - ۱ "
"	ایک روپیہ	ابراہیم لودھی	۰ - - - ۱۰ "

نام اشیا	قیمت	عہد	مقدار اشیا
گیہوں	آٹھ آنے	شہنشاہ اکبر	۱ من — سیر — ۰
،،	ایک روپیہ	اکبر کا دوسرا دور	،، ۴ — ۰ — ۰
چاول	ایک ،،	علاء الدین خلجی	،، ۴ — ۱۹ — ۰
،،	نو آنے	محمد تغلق	،، ۱ — ۰ — ۰
،،	ایک روپیہ	محمد تغلق کا دوسرا دور	،، ۳ — ۰ — ۰
،،	دو روپیے	اکبر	،، ۱ — ۰ — ۰
،،	ایک روپیہ	اکبر کا دوسرا دور	،، ۳ — ۰ — ۰
،،	ایک روپیہ	شہنشاہ عالمگیر	،، ۷ — ۱۰ — ۰
گھی	ایک روپیہ	علاء الدین خلجی	،، ۰ — ۳۳ — ۰
،،	۲½ پیسے	فیروز تغلق	،، ۰ — ۱ — ۰
،،	ایک روپیہ	ابراہیم لودھی	،، ۰ — ۵ — ۰
،،	تین روپیے	اکبر کا پہلا دور	،، ۱ — ۰ — ۰
،،	ایک روپیہ	اکبر کا دوسرا دور	،، ۱ — ۲۴ — ۰
چنا	ایک روپیہ	علاء الدین خلجی	،، ۴ — ۱۹ — ۰
،،	تین آنے	محمد تغلق	،، ۱ — ۰ — ۰
،،	،،	فیروز تغلق	،، ۱ — ۰ — ۰
،،	پانچ آنے	اکبر کا پہلا دور	،، ۱ — ۰ — ۰
چینی	ایک روپیہ	علاء الدین خلجی	،، ۰ — ۱۵ — ۰

چینی	تین روپے	محمد تغلق	۰—سیر—۱ من
”	۳½ پیسے	فیروز تغلق	۰—۰—۱ ”
”	تین روپے بارہ آنہ	اکبر کا پہلا دور	۰—۰—۱ ”
”	ایک روپیہ	” دوسرا دور	۰—۱۸—۰ ”
لال شکر	ایک روپیہ	علاء الدین خلجی	۰—۲۴—۰ ”
”	ایک روپیہ چودہ آنہ	اکبر کا پہلا دور	۰—۰—۱ ”
”	ایک روپیہ	اکبر کا دوسرا دور	۰—۳۰—۲ ”
سرسوں کا تیل	ایک روپیہ	علاء الدین خلجی	۰—۶۷—۰ ”
”	دو روپے گیارہ آنہ	اکبر کا پہلا دور	۰—۰—۱ ”
”	ایک روپیہ	اکبر کا دوسرا دور	۰—۰—۳ ”
مصری	تین روپے بارہ آنہ	محمد تغلق	۰—۰—۱ ”
بیل فربہ فی راس	دو روپے	محمد تغلق	۰—۰—۱ عدد
بکرا فربہ و بکری	دو روپے	”	ایک عدد
بھینس فربہ	”	”	”
مرغا و مرغی	دو پیسے	”	”
گوشت بکری	دو پیسے	”	ایک سیر
”	”	اکبر کا پہلا دور	چار سیر
		عالمگیر	آٹھ سیر
گوشت گائے	ایک پیسہ	محمد تغلق	تین سیر

گوشت گائے	ایک پیسہ	اکبر کا دوسرا دور	چار سیر
,,	نصف پیسہ	عالمگیر	ایک سیر
شالی دھان	چھ آنہ	محمد تغلق	ایک من
,,	بارہ آنہ	اکبر کا پہلا دور	,,
,,	پانچ آنے	اکبر کا دوسرا دور	,,
,,	دو آنے	عالمگیر	,,
سوتی کپڑا نفیس	ایک روپیہ	محمد تغلق	۳۰ گز
,,	,,	ابراہیم لودھی	۱۰ گز
گڑ	ایک روپیہ سات آنہ	اکبر کا پہلا دور	ایک من
,,	ایک روپیہ	اکبر کا دوسرا دور	ایک من ۳۰ سیر
جوار	چھ آنہ	اکبر کا پہلا دور	ایک من
باجرہ	پانچ آنہ	,, پہلا دور	ایک من
,,	ایک روپیہ	اکبر کا دوسرا دور	تین من
نمک	چھ آنہ	,, پہلا دور	ایک من
,,	ایک روپیہ	,, دوسرا دور	دو من ۳۰ سیر
,,	دو روپے آٹھ آنہ	عالمگیر	ایک ٹن
میدہ	تیرہ آنے	اکبر کا پہلا دور	ایک من
دودھ	پندرہ آنے	,, ,,	ایک من
مکھن	ایک آنہ	عالمگیر	آدھ سیر

مچھلی فریہ	دو آنے	عالمگیر	۱۰۰ اعدد
"	تین پیسہ	"	۲۰ پونڈ
موٹھ	چھ آنے	اکبر کا پہلا دور	ایک من
مونگ	ایک روپیہ	" دوسرا دور	آٹھ من

لیکن جونہی انگریز کا منحوس دور آیا تو ہر چیز دن بدن گراں سے گراں تر ہوتی چلی گئی۔ نقشۂ ذیل سے اندازہ لگائیے اور غور کیجئے:

سنہ ۱۷۳۸ء چاول ۲ من ۳۰ سیر ایک روپیہ، گندم ۲ من ۲۰ سیر ایک روپیہ
تیل سرسوں ۱۲ سیر ایک روپیہ۔

سنہ ۱۷۵۰ء چاول ۲ من ۱۰ سیر ایک روپیہ، گندم ۲ من ۱۰ سیر ایک روپیہ
تیل سرسوں ۱۰ سیر ایک روپیہ۔

سنہ ۱۷۵۸ء چاول ایک من ۳۰ سیر ایک روپیہ، گندم ایک من ۳۵ سیر ایک روپیہ
تیل سرسوں ایک من ۸½ سیر ایک روپیہ۔

سنہ ۱۷۸۲ء چاول ایک من ۵ سیر ایک روپیہ، گندم ایک من ۱۵ سیر ایک روپیہ۔
تیل سرسوں ایک من ۷ سیر ایک روپیہ۔

سنہ ۱۸۲۵ء چاول ۳۰ سیر ایک روپیہ، گندم ۳۲ سیر ایک روپیہ
تیل سرسوں ۶ سیر ایک روپیہ۔

سنہ ۱۸۵۸ء چاول ۱۵ سیر ایک روپیہ، گندم ۱۸ سیر ایک روپیہ
تیل سرسوں ۵ سیر ایک روپیہ۔

سنہ ۱۸۸۰ء چاول ۱۲ سیر ایک روپیہ گندم ۱۱ سیر ایک روپیہ
تیل سرسوں ۴½ سیر ایک روپیہ۔

ایک دوسرا نقشہ ملاحظہ ہو: یہ سنہ ۱۸۵۷ء کا نقشہ ہے
اسے بغور دیکھئے:

گندم ۳۲ سیر چاول ۱۸½ سیر چنا ۵۱½ سیر گھی ۴ سیر: ایک روپیہ

ایک اور نقشہ: سنہ ۱۸۹۰ء کے متعلق۔

گندم ۲۵ سیر چاول ۱۲ سیر چنا ۲۸ سیر گھی ۲ سیر دودھ ۹ سیر
ایک روپیہ۔

سنہ ۱۹۲۸ء کا نقشہ:

گندم ۸ سیر چاول ۴ سیر گھی ۸ چھٹانک چنا ۹ سیر دال ۴ سیر
دودھ ۴ سیر ایک روپیہ۔

ایک اور نقشہ ملاحظہ ہو جس سے یہ ثابت ہوگا کہ گرانی تدریجاً کیسے کیسے
بڑھتی گئی:

سنہ ۱۸۰۰ء گندم ایک من ۵ سیر چاول ایک من ۵ سیر تیل سرسوں ۱۴½ سیر
فی روپیہ۔

سنہ ۱۸۱۴ء	گندم	۳۷ سیر	چاول	۳۷ سیر	تیل سرسوں	۵½ سیر	فی روپیہ۔
سنہ ۱۸۲۱ء	"	۳۳	"	۳۰	" "	۵ سیر	"
سنہ ۱۸۳۵ء	"	۲۲	"	۲۴	" "	۴½	"
سنہ ۱۸۷۵ء	"	۱۴	"	۱۷	" "	۳	"

سنہ ۱۹۲۵ء گندم ۴½ سیر چاول ۴½ سیر تیل سرسوں ۱¼ سیر فی روپیہ

اندازہ کیجیئے کہ کس طرح ملکی پیداوار دن بدن گراں ہوتی جارہی ہے اس لئے کہ ایک طرف تو ملک کا خزانہ لوٹ لیا گیا اور دوسری جانب ان اشیاء کو لندن اور برطانیہ کے دوسرے شہروں میں پہنچایا گیا۔ کیونکہ وہاں ان چیزوں کی ضرورت تھی اور اس کے بدلے ہندوستان کو انگلستان کی مصنوعات برآمد کی جانے لگیں کیونکہ ان کے اخراج کی یہی تو ایک منڈی تھی۔ چنانچہ جوں جوں ملکی مصنوعات ختم ہوتی گئیں تو انگلستانی مصنوعات کے لئے کھپت کی گنجائش پیدا ہوتی گئی۔ نقشۂ ذیل میں انگلستانی کپڑے کی برآمدات ملاحظہ ہوں:

سنہ ۱۸۰۰ء	بالکل نہیں آیا۔	سنہ ۱۸۱۴ء	۸ لاکھ گز آیا۔
سنہ ۱۸۲۱ء	دو کروڑ گز آیا	سنہ ۱۸۳۵ء	۵ کروڑ گز آیا۔
سنہ ۱۸۷۵ء	۱۶ کروڑ گز آیا	سنہ ۱۹۲۵ء	ایک ارب ۵۶ کروڑ گز آیا۔

یہ حساب تو اس کپڑے کا تھا جو کہ انگلستان سے ہندوستان کو بھیجا۔ اور ہندوستان نے مجبوراً درآمد کیا۔

اب ذرا اس غلہ کا بھی اندازہ کیجیئے جو کہ ہندوستان سے برآمد کر کے انگلستان بھیجا گیا۔ نقشہ ملاحظہ ہو:

سنہ ۱۸۲۳ء	۱۱ کروڑ ۸۶ لاکھ ۸۳ ہزار سات سو ۱۰ من گندم۔
سنہ ۱۹۱۳ء	۳ کروڑ ۵۰ لاکھ من گندم
سنہ ۱۹۱۵ء	۸۳ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن گندم

سنہ ۱۹۱۷ء	۲۹ لاکھ دس ہزار ٹن گندم
سنہ ۱۹۱۶ء	۴۵ لاکھ ۱۰ ہزار ٹن گندم

یہ تو گیہوں کا حال تھا اب ذرا چاول کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے:

سنہ ۱۸۸۳ء	۱۱۸ من فی منٹ کے حساب سے برآمد ہوتے۔
سنہ ۱۹۱۳ء	۱ کروڑ ۵۷ لاکھ من برآمد ہوئے۔
سنہ ۱۹۱۵ء	۴۰ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن برآمد ہوئے۔
سنہ ۱۹۱۸ء	۵۶ کروڑ ۵۰ لاکھ من برآمد ہوئے۔

نتیجۂ بحث

ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک بھوکوں مرنے لگا جن ہندوستانیوں نے کبھی قحط کا نام بھی نہیں سنا تھا قحطوں کا شکار ہونے لگے اور ایسے سخت اور ہمہ گیر قحط ہوئے کہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ لقمۂ اجل ہو گئے۔ قحطوں کا اندازہ کرنے کے لئے نقشہ ذیل ملاحظہ فرمائیے:

سنہ ء	انگلستان	ہندوستان	وسعت قحط ہندوستان
سنہ ۱۰۰۰ء تا سنہ ۱۱۰۰ء	۲۰ قحط	۲ قحط	صرف دہلی تک محدود تھا
سنہ ۱۱۰۰ تا ۱۲۰۰ء	۱۵	۱	دہلی کے گرد و نواح میں
سنہ ۱۲۰۰ء تا ۱۳۰۰ء	۱۹	۳	مقامی
سنہ ۱۳۰۰ء تا سنہ ۱۴۰۰ء	۱۶	۳	مقامی
سنہ ۱۴۰۰ تا ۱۵۰۰ء	۹	۲	"
سنہ ۱۵۰۰ تا سنہ ۱۶۰۰	۱۵	۳	"

سنہ ۱۶۰۰ تا سنہ ۱۷۰۰ء	۶ قحط	۳ قحط	غیر معین

اب ذرا اس سے بعد کے زمانہ کا اندازہ لگائیے جب برطانوی نظام حکومت ہندوستان میں رائج ہوتا ہے تو معاملہ بالکل اس کے برعکس ہو جاتا ہے

سنہ ۱۷۰۰ تا سنہ ۱۸۰۰ء	۷ قحط (انگلستان)	۱۱ قحط	کل ہند میں
سنہ ۱۸۰۰ تا سنہ ۱۹۰۰ء	۱ "	۳۱ "	"

سر ولیم ڈگبی کا نقشہ یہ بتلاتا ہے کہ ان ۳۱ قحطوں میں جو نقصان ہے وہ بیان بحساب ربع صدی کے لحاظ سے ہے:

پہلا ربع	۵ قحط	۱۰ لاکھ نفوس مرے
دوسرا ربع	۲ "	۱۰ لاکھ " "
تیسرا ربع	۶ "	ایک کروڑ " "
چوتھا ربع	۱۸ "	۲ کروڑ ۶ لاکھ نفوس لقمۂ اجل ہوئے۔

غرضیکہ ہندوستانی فاقوں مرتے گئے اور انگریز کی حرص و آز کی آگ پھر بھی ٹھنڈی نہ ہوئی۔ اب ہم اس بحث کو یہاں ختم کرتے ہیں۔

منصوبۂ سوم

اقوامِ عالم کی اخلاقی امداد کا حصول

اس مقصد کی خاطر پانچ ملکوں میں کام کیا گیا۔ جاپان، چین، برما، فرانس اور امریکا۔ کام کی نوعیت صرف مشنری طریقہ تھا۔ اس لئے کہ اقوام عالم کو ہم خیال بنانے کے لئے اس وقت کوئی ایسا بین الاقوامی ادارہ تو تھا نہیں جیسا کہ آجکل اقوام متحدہ کا ادارہ ہے یا اس سے پہلے جمعیت اقوام کا ادارہ تھا۔ جہاں ہر ملک اپنا پروپیگنڈا کر سکتا ہے اس لئے کہ یہ دونوں ادارے تو بعد میں وجود میں آئے ہیں۔ لہٰذا اس وقت پروپیگنڈے کے صرف دو ہی طریقے تھے جن سے اقوام عالم کو اپنا ہم خیال بنایا جا سکتا تھا۔ ایک تو سفارت کا طریقہ تھا اور دوسرا مشنری کا طریقہ تھا۔ پہلا طریقہ تو چونکہ حکومت کے ذریعے سے عمل میں لایا جا سکتا تھا اور یہاں ہندوستانی غریبوں کی اپنی حکومت نہ تھی اس لئے مجبوراً دوسرا طریقہ برتا گیا۔ اور ان ملکوں میں مشن بھیجے گئے۔ (چینی و برمی مشن) چنانچہ سب سے پہلے ایک مشن مولانا مقبول الرحمٰن صاحب سرحدی اور مسٹر شوکت علی کی سرکردگی میں چین بھیجا گیا۔ م۔ مولانا مقبول الرحمٰن صاحب صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے اور دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر حضرت شیخ الہند رح کی تحریک میں شریک

ہو گئے تھے ۔ چونکہ انگریزی نہیں جانتے تھے اس لئے آپ کے ساتھ آپ کا معاون مسٹر شوکت علی صاحب کو بنایا گیا ۔ مسٹر شوکت علی بنگال کے رہنے والے تھے ۔ انگریزی میں بی اے ہونے کے ساتھ آپ چینی زبان بھی جانتے تھے بااخلاق نوجوان تھے ۔ ایک اچھے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ۔ آزادیٔ وطن کے شوق میں اس انقلابی تحریک کے ممبر بن گئے تھے ۔ مجھ سے مولانا مقبول الرحمٰن کی ملاقات ۱۹۴۲ء میں ہوئی تھی ۔ انھوں نے زبانی اپنے مشن کے حالات سنائے تھے کہ ہم کل آٹھ آدمی مشن میں تھے ۔ ہم نے چین میں مذہبی طریق پر کام کرنا زیادہ مناسب سمجھا ۔ پہلے تو ہندو ممبر اس تجویز سے متفق نہ ہوئے لیکن جب کچھ دن بعد یہ تجربہ کامیاب رہا تو وہ بھی متفق ہو گئے ۔ چنانچہ ہم نے وہاں سیرت کمیٹی کی ایک مرکزی جگہ متعین کے ایک مرکزی کمیٹی مقرر کر دی اور باقی ملک میں اس کی شاخیں بنائیں ۔ اس مذہبی طریق سے ہم نے پہلے وہاں کے مسلمانوں کو اور پھر عام لوگوں کو اپنی آزادی کے جذبے کا ہم خیال بنانا شروع کیا ۔ اس میں ہمیں نہایت کامیابی ہوئی ۔ چنانچہ ہم نے ایک ماہانہ رسالہ "الیقین" کے نام سے جاری کیا ۔ یہ چینی اور اُردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا ۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء تک جب وہاں کام ہو چکا تو مرکزی احکام کے تحت ہم وہاں سے برما چلے آئے ۔ اور یہاں اواخر ۱۹۱۵ء تک کام کیا لیکن چینی عوام بالکل خالی الذہن تھے اس لئے جو کامیابی ہمیں چین میں حاصل ہوئی وہ برما میں مشکل تھی اس لئے کہ یہاں کے عوام برطانیہ کے زیر اثر تھے ۔ خیر ہم کو یہاں بھی اپنے مشن میں

کامیابی ہوئی۔ ہم نے یہاں بجائے مذہبی طریق کے انسانی خدمت کے اصولوں پر کام شروع کیا۔ کیونکہ یہاں ہندوستان کی طرح مذہبی افتراق عروج پر تھا یہاں بھی برطانیہ کی پالیسی یہی تھی کہ لڑاؤ اور حکومت کرو۔ اس لئے انھوں نے اپنے زیر اثر ممالک میں مذہبی جھگڑوں کو ہوا دے کر باہمی افتراق و انشقاق پیدا کر دیا تھا۔ چین میں گو اس وقت شخصی حکومت تھی لیکن وہاں مذہبی جھگڑے نہ تھے۔ اس لئے ہم وہاں مذہبی اصولوں پر کام کرتے ہیں کامیاب ہوئے۔ لیکن اگر ہم یہاں ایسا کرتے تو یقیناً کامیاب نہ ہوتے کیونکہ غیر مسلم اقوام ہمارا ساتھ نہ دیتیں۔ اور مسلمانوں میں کئی فرقے تھے۔ ہم کسی ایک کا ساتھ بھی نہ دیتے تو ضرور کوئی نہ کوئی مسئلہ ایسا زیر بحث آ ہی جاتا جس سے دوسرے فرقے ہم سے بدظن ہو جاتے اس لئے ہم نے یہاں مذہبی اصولوں کے بجائے انسانی اصولوں پر کام شروع کیا۔ چنانچہ ہم نے یہاں انسانی برادری کے نام سے ایک انجمن بنائی اور انسانی فلاح و بہبود کے ضمن میں ہم اپنے نصب العین کی اشاعت کرتے رہے۔ یہ بات غلط ہے کہ ہم نے یہاں "الانسان" نام سے کوئی اخبار نکالا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نام کی ایک کتاب میں نے عربی زبان میں لکھی تھی اور مسٹر شوکت نے اس کا ترجمہ انگریزی اور برمی زبان میں کر کے شائع کی تھی۔ غرضیکہ ہم اپنے نظریات و افکار میں یہاں بھی کامیاب ہوئے۔

جب ہم چین گئے تھے تو آٹھ آدمی تھے اور وہاں ہم نے اپنے اخراجات کا انتظام یہ کیا کہ ایک مطب کھول دیا جس میں یونانی اور مسٹر شوکت

ڈاکٹری علاج کرتے تھے۔ اُس کی آمدنی اتنی تھی کہ ہمیں کوئی تکلیف پیش نہ آئی ہم سب دوستوں کا کام چل رہا تھا۔ جب ہم وہاں سے رخصت ہونے لگے تو ہم نے اسے فروخت کر دیا جس سے ہم نے اپنا زادراہ بھی بنایا۔ اور جو چین ساتھی وہاں رہ گئے ان کو خرچ کے لئے بھی کچھ رقم دے آئے۔ برما میں ہم صرف چار آدمی تھے کیونکہ تین ساتھی تو چین میں کام کی نگرانی کے لئے رہ گئے اور ایک ممبر واپس وطن چلا آیا تھا۔ ہم نے یہاں کپڑے کا کاروبار شروع کیا، اور خوب آرام سے دن کاٹے۔ ۱۹۱۶ء میں جب تحریک کی ناکامی کی اطلاع ملی تو شوکت صاحب دوسرے دو ہندو ممبروں کے ساتھ ہندوستان واپس چلے آئے۔ یہاں سے پھر روپوش ہو کر برلن چلے گئے۔ میں رنگون چلا گیا۔ وہاں میں نے مطب چلایا اور ۱۹۲۳ء میں حج کر کے وطن لوٹ آیا۔ یہ تفصیل حضرت مولانا مقبول الرحمٰن کی زبانی میں نے سنی ہے۔ حضرت مدنی نے اس مشن کا صرف اجمالی اشارہ تعلیمی ہند میں کیا ہے۔

جاپانی مشن

پانچ ممبروں کا ایک دوسرا مشن پروفیسر برکت اللہ صاحب مرحوم کی قیادت میں جاپان بھیجا گیا۔ پروفیسر برکت اللہ ریاست بھوپال کے ایک افسر کے بیٹے تھے انگریزی ایم۔ اے تھے۔ ترکی، جرمنی، جاپانی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ عربی کی تعلیم معمولی تھی۔ اس لئے ہم ان کو پروفیسر کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ رولٹ کمیٹی

اُن کا مولانا کے لقب سے ذکر کرتی ہے جو درست نہیں۔ آپ ابتدا سے آزاد طبع تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد والد نے نوکری کے لئے مجبور کیا لیکن آپ کی طبیعت ملازمت کو پسند نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ کچھ عرصہ تو بھوپال میں پرائیویٹ طور پر تعلیم و تدریس کا مشغلہ اختیار کر کے ذریعہ معاش صرف ٹیوشن کو بنائے رکھا۔ اسی دور میں کسی ذریعے سے آپ اس انقلابی تحریک سے واقف ہوئے تو سب کام چھوڑ کر اسی میں لگ گئے۔ اسی عرصے میں کرشنا ورما سے دوستانہ ہو گیا۔ آخر آپ کو چار دوسرے ممبروں کا قائد بنا کر جاپان بھیجا گیا۔ آپ نے ٹوکیو کے ایک کالج میں پروفیسری اختیار کر لی۔ اور ساتھ ہی ایک انجمن اسلامک فرنیٹرنٹی کے نام سے بنائی اور اسی نام کا ایک روزنامہ بھی جاپانی اور انگریزی زبان میں جاری کیا۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۰ء تک وہاں کام کیا۔ اسی دور میں چونکہ فرانس کے مشن کو ایک ایسے قابل آدمی کی ضرورت تھی اور وہاں کوئی قابل آدمی تھا نہیں اس لئے مرکز نے ان کو حکم دیا کہ آپ اپنے ساتھیوں میں سے تین کو جاپان میں کام سپرد کر کے ایک آدمی کو ساتھ لے کر فرانس چلے جائیں۔ کیونکہ یہاں کام ہو چکا ہے، یہاں اب آپ کی ضرورت نہیں۔ وہاں کام بالکل نامکمل ہے وہاں آپ کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ نے اخبار بند کر دیا اور پروفیسری سے استعفا دے کر فرانس چلے گئے۔

م: رولٹ کمیٹی نے لکھا ہے کہ چونکہ مولانا برکت اللہ صاحب حکومت برطانیہ کے خلاف باغیانہ خیالات کی نشر و اشاعت سخت لب و لہجہ میں کرتے

تھے اس لئے حکومت جاپان نے آپ کو پروفیسری سے معطل کر کے اخبار بند کر دیا۔ اور آپ کو ملک چھوڑنے کا حکم دے دیا، اس لئے آپ فرانس چلے گئے لیکن یہ سب غلط ہے۔ میں نے خود فرانس کے مشن کے منیجر چوہدری رحمت علی صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے اس رپورٹ کو غلط بتایا۔ اور وہ بات بیان کی جو اوپر حضرت مدنی رح کے بیان میں ہے کہ آپ مرکز کے حکم سے فرانس گئے تھے اور یہی بات ٹھیک بھی ہے۔ اس لئے کہ حکومت جاپان اس زمانہ میں خود برطانیہ کے سخت خلاف تھی جس کے نتیجے میں دوسری جنگ عظیم میں جاپان نے برطانیہ پر حملہ کر دیا۔ تو پھر برطانیہ کے خلاف باغیانہ خیالات کی نشر و اشاعت کی بنا پر وہ مولانا برکت اللہ کے مخالف کیسے ہو سکتی تھی۔ یہ محض رولٹ کمیٹی کی غلط تحقیق ہے یا غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ واللہ اعلم!

فرانسیسی مشن

چوہدری رحمت علی پنجابی کی زیر قیادت میں ایک مشن فرانس بھیجا گیا رانجھا رصاحب ایک تعلیم یافتہ نوجوان بھی اُن کے ساتھ مدد گار تھا۔ چوہدری صاحب خود بھی انگریزی کے بی۔ اے تھے لیکن پھر بھی اس مشن کو چار سال بعد پروفیسر برکت اللہ جیسے آدمی کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ پروفیسر صاحب ٹوکیو سے پیرس چلے گئے۔ اور پھر وہاں انجمن

(غدر پارٹی) کی جانب سے "انقلاب" نام اخبار جاری کیا۔ دو سال یہاں کام کیا اور کام مکمل ہو گیا۔ اس مشن میں کل تین آدمی تھے۔ اب پروفیسر برکت اللہ اور ان کے ساتھی آجانے سے ان کی تعداد تین سے پانچ ہو گئی۔

امریکی مشن

امریکہ میں ہردیال صاحب کی قیادت میں چھ آدمیوں کا مشن بھیجا گیا۔ اور انھوں نے کام بھی اچھا کیا۔ پھر بعدہٗ پروفیسر برکت اللہ اور چوہدری رحمت علی صاحب بھی فرانس سے امریکہ چلے گئے۔ اور ممبروں کی تعداد چھ سے بڑھ کر آٹھ ہو گئی۔ ویسے چوہدری رحمت علی پہلے بھی پیرس سے امریکہ کے شہر واشنگٹن میں آتے جاتے رہتے تھے لیکن پہلے مستقل رہائش پیرس میں تھی اور اب واشنگٹن میں مستقل قیام کر لیا۔ امریکی مشن نے بھی یہاں غدر پارٹی کے نام سے انجمن بنائی تھی۔ اور پروفیسر برکت اللہ کے تشریف لانے کے بعد اسی نام کا ایک اخبار بھی واشنگٹن سے جاری کیا۔ جو ایک روزنامہ تھا اور اس میں اپنے نصب العین کی نشر و اشاعت ہوتی تھی۔

م : ایک دفعہ پنجاب کے ایک دیہاتی گاؤں میں مذہبی تبلیغ کے سلسلے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک معمر بزرگ کے ہاں ٹھیرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں اُن صاحب کے اخلاق و عادات نشست و برخاست گفتار و

کردار سے بےحد متاثر ہوا۔ اُن میں اکابر کے آثار نظر آئے۔ مثلاً سحر خیزی اور تہجد گزاری ، سنجیدہ اور متین ہونے کے علاوہ سارا گاؤں زمینداروں کا ان کے زیر اثر۔ انھوں نے سحری کے وقت اٹھ کر پہلے نماز پڑھی پھر چائے پی اور مولانا آزاد کی طرح قرآن کے مطالعے میں مستغرق ہو گئے۔ اور میں اُن کے مطالعے میں منہمک رہا۔ صبح کی چائے سے فارغ ہوئے تو میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ کی تعریف کیا ہے؟ جواب ملا کہ مجھے رحمت علی کہتے ہیں۔ میں نے پھر دریافت کیا کہ آپ کی بیعت کس سے ہے؟ فرمایا نام لیتے شرم آتی ہے میں اُن سے کیا نسبت رکھتا ہوں ہاں اُن کا بدنام کنندہ ضرور ہوں۔ میں نے دوبارہ اصرار کیا تو ٹھنڈا سانس لے کر فرمایا مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کا بدنام کنندہ ہوں۔ مجھے معاً خیال آیا کہ یہ وہی چوہدری رحمت علی تو نہیں جن کا نام تاریخوں میں پڑھا ہے۔ چنانچہ میرے استفسار پر بتایا کہ میں وہی نکارہ ہوں۔ وقت میری روانگی کا تھا اور رات کی طویل صحبت ناواقفی میں ضائع کر چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اس مختصر وقت میں مَیں نے ان سے تاریخی باتیں پوچھیں اور انھوں نے تحریک کے مفصل حالات بتلائے۔

چوہدری صاحب نے چند باتیں نئی بتائیں جو عام لوگوں کو معلوم نہیں اس لئے میں چوہدری صاحب کے الفاظ میں ان کو یہاں درج کئے دیتا ہوں۔

(۱) فرمایا فرانس میں ہم نے جو پارٹی قائم کی تھی اس کا نام بلشیک غدر پارٹی تھا لیکن جو اخبار فرانس میں جاری کیا تھا اس کا نام رولٹ رپورٹ

میں بھی غدر بتایا گیا ہے اور اسی طرح علمائے ہند کا شاندار ماضی میں بھی غدر ہی درج ہے۔ غالباً مصنف نے رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پر اعتبار کیا ہے اس لئے وہی نام درج کر دیا جو رولٹ رپورٹ میں درج تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ غدر نام اس اخبار کا تھا جو کہ واشنگٹن (امریکہ) سے نکلتا تھا۔ اور جو اخبار پیرس سے نکلتا تھا اس کا نام الانقلاب تھا۔ رولٹ کمیٹی والوں کو اس سے مغالطہ لگا کہ جس پارٹی کی جانب سے یہ نکلتا تھا اس کا نام غدر پارٹی تھا۔ پھر مدیر بھی دونوں کا ایک ہی تھا۔ غدر اور الانقلاب دونوں کے مدیر مولانا برکت اللہ مرحوم تھے۔

پھر فرمایا کہ ہم نے اپنے اخراجات کی خاطر رنگوں کا کاروبار شروع کیا تھا۔ اور ہندوستان کے بہت سے تحریک کے ممبر ہم سے رنگ منگواتے تھے۔ اور یہاں تاجروں کو سپلائی کرتے تھے۔ چنانچہ پشاور کے دو مسلمان اور ایک ہندو، لاہور کے دو مسلمان اور پانچ ہندو، دہلی کے چار مسلمان اور تین ہندو، بمبئی کا ایک مسلمان اور چار ہندو، کلکتہ کے چار ہندو اور دو مسلمان، کراچی کا ایک ہندو، ڈھاکہ کے دو ہندو اور ایک مسلمان ہمارے خریدار تھے۔ درحقیقت یہی لوگ تھے جن کے ذریعے سے ہم مرکز (دہلی) سے ہدایت حاصل کرتے رہتے تھے۔ اور انہی کے واسطے سے اپنی کارگزاری کی رپورٹ ہم مرکز کو باقاعدہ بھیجتے رہتے تھے۔ ورنہ ڈاک کے ذریعے تو یہ کام ناممکن تھا۔

اور فرمایا کہ امریکہ میں میں نے خود جو رقم زمین بیچ کر ساتھ لے لی تھی اس سے ایک مکان کرایہ پر لے کر ہوٹل چلایا تھا جس کے ایک کمرے میں پارٹی کا دفتر تھا اور ایک میں اخبار کا دفتر۔ اور یہی ہوٹل ہماری باغیانہ تحریک کا مرکز بھی تھا اور اسی سے

ہم اپنے اخراجات بھی چلاتے تھے یہیں کے آنے سے پہلے یہ ہردیال صاحب کی نگرانی میں چلتا رہا۔ اور جب میں پیرس سے آگیا تو میری نگرانی میں چلتا رہا۔ جنگ عمومی کے دور میں جب امریکہ بھی شریک جنگ ہوگیا تو ہمیں خطرہ محسوس ہوا۔ چنانچہ ہم نے ہوٹل بیچ دیا اور اخبار بھی بند کردیا اور اس رقم سے سفر خرچ بنا کر پہلے پیرس آئے پھر جنیوا ہوتے ہوئے برلن پہنچے۔ پھر وہاں سے افغانستان آکر اپنے ساتھیوں سے مل گئے۔ اور تحریک کی ناکامی سے جو صدمہ اور زخم پہنچا تھا دوستوں کی ملاقات سے اس کی مرہم پٹی ہوگئی۔

منصوبۂ چہارم

جنگی نقشوں کی تیاری

دشمن کے ارادوں کی جاسوسی۔ دشمن فوجوں کو ہم خیال بنانا

اس اسکیم میں ان تین مستقل کاموں کو انجام دینا تھا۔ چنانچہ انقلابی رہنماؤں نے ان میں سے ہر کام کے لئے علیحدہ علیحدہ کارکن مقرر کئے۔ پہلے کام کا مقصد یہ ہے کہ جب باہر سے کوئی فوج ہندوستان پر حملہ کرے گی تو اس کے لئے جنگی نقشہ اشد ضروری ہے جس میں حملہ کے راستوں اور محاذوں کا تعین ہو۔ اور ہر محاذ کی حیثیت پناہی و پیش بینی کے پورے انتظامات کا خیال رکھا جائے اور رسد رسانی و پیغام رسانی کے خفیہ راستوں کا تعین کیا جائے۔ اور حملہ آور فوج اور باغی رہنما کاروں کے باہمی اتصال و انقطاع کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔ اور سب سے اہم یہ ہے کہ حملہ آور فوج کا اپنے مرکز سے رابطہ اور امدادی فوجوں اور لشکر کی رسد کے سب نشیب و فراز کا لحاظ ہو۔ سو نقشۂ جنگ وہی مکمل ہوگا جس میں ان امور کا فوجی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا گیا ہو۔ ورنہ ویسے تو سب جغرافیائی نقشے ہر قسم کی جنگ کے لئے بیکار ہیں۔

حضرت شیخ الہند رح اس ضرورت سے بے خبر نہ تھے۔ انھوں نے اس کام

کے لئے موزوں اور مناسب آدمیوں کا انتخاب کیا۔ اس لئے کہ اس کام کو وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو ایک طرف تو اصولِ جنگ سے باخبر ہو اور دوسری جانب وہ انقلابی اور جنگی ذہن کا مالک ہو۔ حضرتؒ نے اس کام کے لئے حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحؒ کو چنا اور آپ کا مددگار شیخ محمد ابراہیم صاحب کو بنایا۔ شیخ محمد ابراہیم صاحب بمبئی کے رہنے والے صالح نوجوان تھے۔ آپ انگریزی کے بی اے تھے۔ اور ایک کالج سے اقتصادیات کے ایم۔ اے کی ڈگری لی ہوئی تھی۔ لیکن بایں ہمہ نہ تو فنونِ جنگ سے واقف تھے اور نہ ہی جنگی ذہن رکھتے تھے۔ اس لئے وہ تو اس کام میں چنداں کامیاب نہ ہو سکے لیکن مولانا سندھی مرحوم نے سات سال خرچ کر کے اس کام کو مکمل کیا۔ ہندوستان کے شمال مغرب سرحد کے بارہا دورے کئے اور وہاں کے راستوں کا بار بار مطالعہ کرنے کے بعد جنگ کا مکمل نقشہ تیار کیا۔ چنانچہ مولانا سندھی رح خود تحریر فرماتے ہیں کہ یار ہا جب میں کابل پہنچا تو معلوم ہوا کہ ہمارا کابل کا وفد ترکی اور جرمنی مشن کی نقشۂ جنگ کے بارے میں تسلی نہیں کرا سکا۔ خود مہندر پرتاپ صاحب اور شیخ ابراہیم بھی اُن کا اطمینان نہیں کرا سکے۔ جرمنی اور ترکی مشن سے جب ہم پہلی دفعہ ملے تو معلوم ہوا کہ وہ بالکل غیر مطمئن ہیں اور ہمارے وفد سے بدظن ہو چکے ہیں۔ لیکن ہم نے دو تین ملاقاتوں میں ان کی تسلی کرا دی اور وہ بالکل مطمئن ہو گئے۔ کیونکہ ہمارے پاس جنگ کا مکمل نقشہ تھا۔ اور ہمارے ساتھیوں میں کوئی شخص بھی شمال مغربی سرحد کے جغرافیۂ جنگ سے واقف نہ تھا اور ہم نے سات سال متواتر اس کے جغرافیائی مطالعے اور معائنے میں صرف کئے تھے

اور ہم اپنی اس بار بار کی صحرا نوردی اور دشت پیمائی میں ہمیشہ اسی ادھیڑ بن میں لگے رہتے تھے۔ ہمارے ناخنِ فکر نے اس کی سب الجھی ہوئی گرہوں کو کھول کر صاف کر دیا تھا۔ ہم نے جنگی قواعد کے مطابق ہر راستے کے نشیب و فراز اور ہر محاذ کی پشت پناہی و پیش بینی اور حملہ آور فوج و باغی رضاکاروں کے باہمی روابط و تعاون اور رسد رسانی و پیغام رسانی کے راستوں کا تعین اور امدادی دستوں کے مواقع وغیرہ سب امور پر اپنے اس نقشۂ جنگ میں تفصیل درج کی ہوئی تھی۔ اس لیئے کہ قدیم اصولِ جنگ اور جدید قواعدِ حرب سے ہم بخوبی واقف تھے۔ بیت العلم کی لائبریری کے مطالعے کے دوران ہم نے قدیم فنِ حرب کا مطالعہ پورے غور سے کیا تھا۔ پھر قیامِ دہلی کے دور میں حضرت شیخ رح کی توجہ دلانے پر ہم نے انگریزی جرمنی، فرنچ، ترکی اور عربی زبانوں کی بہت سی کتابیں منگوا کر جدید فن حرب کا مطالعہ کر کے اس فن میں کافی استعداد بہم پہنچالی تھی۔ اس لئے کہ قدیم فن حرب اس زمانے میں چنداں مفید نہیں۔ گو اصولی طور پر قدیم و جدید میں بہت معمولی فرق ہے۔ مگر پھر بھی قدیم اصولوں کو جب تک جدید قواعد و ضوابط کی روشنی نہ پرکھا جائے تو وہ بیکارِ محض رہ جاتے ہیں۔ پھر یونانیوں نے اس فن میں جو کچھ لکھا ہے وہ عربوں کے اصول سے بہت مختلف ہے۔ اور عجمیوں کے فنون تو قریباً عربوں نے اپنا لئے تھے۔ پھر کلدانیوں، رومیوں اور یونانیوں کا اندازِ فکر ایک اور ہی ڈگر پر ہے۔ اور عربوں کا قریباً موجودہ مغربی طرزِ فکر سے ملتا جلتا طور و طریق ہے۔ خلاصے کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یونانی،

کلدانی اور رومانی فنِ حرب کو عربوں نے موجودہ مغربی فنِ حرب کے قریب کر دیا تھا۔ پہلے فنِ حرب کو قدیم اور موجودہ کو جدید اور عربوں کے فنِ حرب کو ان دونوں کے درمیان ایک واسطہ و برزخ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم اگر عربوں کے فنِ حرب سے واقف نہ ہوتے تو جدید فنِ حرب سے زیادہ فائدہ حاصل نہ کر سکتے۔ ہمارے لئے عربوں کے فنونِ حرب کے مطالعے نے جدید فنونِ حرب و جنگ کے سمجھنے کے لئے مبادی و مقدمات کا کام دیا۔ جرمنی و ترکی افسر چونکہ عربوں کے فنونِ حرب سے واقف نہ تھے وہ صرف جدید فنون سے واقف تھے۔ اس لئے ہم ان کی معلومات میں اضافے کا باعث ہوئے۔ بعد کی کئی ایک ملاقاتوں میں وہ ہم سے استفادہ کرتے رہے۔ پھر امان اللہ خاں کے دورِ حکومت میں جب افغان برٹش جنگ چھڑ گئی تو اس وقت ہم نے اپنی استعداد سے افغان افسروں کو ہر ممکن فائدہ پہنچایا۔ اور افغان حکومت اس کا پوری طرح شکریہ و قدر کرتی رہی جس سے ہمارے ساتھیوں کو فائدہ پہنچا۔ میں اس معاملے میں بھی اپنے شیخ رح کا شکر گزار ہوں، "والحمد للہ علیٰ ذالک"۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم نے سوویٹ روس میں انٹرنیشنل سیاست کا مشاہدہ کیا اور اشتراکی انقلابیوں کے اصولِ انقلاب کا مطالعہ اور تجرباتی مہموں کا معائنہ کیا تو اپنی معلومات میں ہم نے کوئی کمی محسوس نہیں کی۔ اور اسی بنا پر افغان برٹش محاربہ کے دوران امیر امان اللہ خاں اپنی جنگی مہمات میں ہم سے مشورہ لیتا اور اس پر عمل کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ ہم نے اپنے نوجوان ساتھیوں

کو بھی ان اصول کی تربیت دے کر مستعد بنا دیا تھا۔ چنانچہ بہت سے محاذوں پر ہمارے یہ نوجوان کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے اور افغان حکومت سے داد حاصل کرتے رہے۔ ظفر حسن ٹل کے محاذ پر سپہ سالار محمد نادر خاں کا مددگار تھا۔ اور اس نے بہت زیادہ تحسین حاصل کی۔ میرا بھتیجا محمد علی قندھار کے محاذ پر اعتماد الدولہ کا معاون تھا، اور وہ وہ کارنامے انجام دیئے کہ اعتماد الدولہ نے آپ کو خاص خلعت سے نوازا۔ مجھے خود دو دفعہ دو محاذوں پر امیر امان اللہ خاں کے ساتھ جانا پڑا اور کامیابی حاصل ہوئی۔" مولانا سندھی کا بیان یہاں ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرا کام تھا دشمن کے ارادوں اور پالیسیوں کی سراغ رسانی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ سی آئی ڈی میں اپنے آدمی بھیجے جائیں جو بظاہر دشمن کے ملازم و وفادار ہوں لیکن اندرونی طور پر وہ اُن کے حالات اور اہم خبریں انقلابیوں کو پہنچاتے رہیں۔ چنانچہ اس کام کے لئے بہت سے ہندو اور مسلم نوجوان قائدین کے مشورے سے اس محکمے میں ملازم ہو گئے اور سراغ رسانی کا کام بخوبی انجام دیتے رہے (۴)۔ افسوس کہ حضرت مدنی رح نے اس بحث میں صرف اشارات پر اکتفا کی ہے کہ ڈاکٹر انصاری کے ذریعے سے بعض اہم خبریں حضرت شیخ رح تک پہنچ جاتی تھیں۔ اور حضرت مولانا سندھی نے بھی صرف اتنا اشارہ فرمایا کہ سی آئی ڈی کے محکمے میں جو لوگ ہماری محبت میں گئے تھے اُن سے ہمارے روابط اچھے تھے۔ مزید برآں کچھ وضاحت نہیں فرمائی کہ کون کون لوگ اس محکمے میں جاسوسی کے لئے ملازم ہوئے۔ اور کون کون

آخر پکڑے گئے۔ اور پھانسی پر لٹکائے گئے۔ درحقیقت انگریزی دورِ حکومت میں تو یہ تفصیل ہو بھی نہیں سکتی تھی اور آزادی کے بعد کس کو علم ہے کہ تفصیل بتائے۔ بہت سے دوسرے واقعات کی طرح یہ واقعہ بھی پس پردہ ہے اور اُس کے اسرار و رموز ان لوگوں کے سینوں میں اُن کے ساتھ ہی دفن ہو گئے۔ البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس کام کے سربراہ ڈاکٹر انصاری مرحوم تھے۔ اور انہی کی سرپرستی میں یہ کام ہوتا رہا۔

تیسرا کام تھا دشمن کی فوجوں میں انقلابی کارکنوں کو پہنچانا اور وہاں پہنچ کر ایک تو ان کے حالات کی اطلاع انقلابی لیڈروں کو پہنچانا۔ اور دوسرے دشمن کی فوجوں میں معاملہ فہم حضرات کو اپنا ہم خیال بنانا۔ اس کام کے لئے بھی ہمارے اکابرین تحریک نے کئی ایک نوجوانوں کو انتخاب کر کے انہیں انگریزی فوجوں میں بھرتی کرایا۔ اُن میں بعض لوگ بعد میں پکڑے بھی گئے اور کچھ لوگ اختتام جنگ کے بعد مختلف تدبیروں سے اپنے نام فوج سے خارج کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور بعض مستقل مزاج حضرات وہاں ہی پکے ہو کر رہ گئے۔ اور مستقل مزاجی سے اپنا کام دھیمی رفتار سے کرتے رہے۔ تا آنکہ جنگ عظیم ثانی میں یہی لوگ دوسرے افراد کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے اور بعد میں آزاد ہند فوج میں ظاہر ہوئے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

۴: حضرت مدنی رح نے اس شق کو بھی حضرت سندھی کی طرح مجمل چھوڑ دیا ہے اور ان لوگوں کے کام کی کوئی تفصیل نہیں بتائی۔ اس تحریک کے

ایک مدبر بزرگ سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اب بھی بقید حیات ہیں اور اب
بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کے جذبات اسی طرح جوان ہیں۔ حضرت سندھی سے
بیعت ہیں۔ اور چھ سال انگریزی فوج میں ایک جتھے کی قیادت ان کے ہاتھ میں
رہی ہے۔ اور ان کو اس معاملے کی وسیع معلومات حاصل ہیں لیکن کوئی بات
بتانے میں وہ اب بھی بخل سے کام لیتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں۔ انھوں نے
بتایا کہ پنجاب کے ۱۹ نوجوانوں کا ایک جتھہ میری قیادت میں حضرت سندھی کے
حکم سے انگریزی فوج میں بھرتی ہوا۔ ہم فوج میں نہایت احتیاط سے اپنی
تبلیغ کرتے تھے۔ ہمیں پہلے تین مہینے کام کے خفیہ رکھنے اور بتدریج اپنے
مشن کو چلانے اور دوسری اہم باتوں کی مشق کرائی گئی۔ اور تربیت دی گئی۔
ہم کل تربیت پانے والے اسی آدمی تھے۔ لیکن تین ماہ کا تربیتی کورس پورا
کرنے کے بعد جب امتحان ہوا تو اسی میں سے صرف ۱۹ آدمی پاس ہوئے
باقی سب فیل ہو گئے۔ ان کو دوسرے آسان کاموں میں لگا دیا۔ ہم کورس پاس
کرنے کے بعد دیوبند بھی گئے تھے۔ وہاں حضرت شیخ الہند سے ملاقات ہوئی۔
ہم کسی پروگرام کے تحت نہیں گئے تھے صرف سیر اور زیارت غرض تھی۔ وہاں
ہم دو دن ٹھہرے تھے۔ ہم میں صرف چھ مسلمان تھے، باقی تین سکھ اور دوسرے
سب ہندو تھے۔ لیکن کھانا ہم سب ایک ساتھ کھاتے تھے۔ ہم سؤر اور جھٹکہ تو
نہیں کھاتے تھے مگر ہندو ممبر بڑا گوشت بھی کھا لیتے تھے۔ باقی کھانے پینے
میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا تھا۔ ہندو کوئی کراہت وغیرہ نہیں کرتے تھے۔
یہ خیالات ہم میں بالکل ختم ہو چکے تھے۔ دیوبند میں ہمارا کھانا دو مسلمان ملازم

تیار کرتے تھے۔ وہاں ہم حضرت شیخ الہند کے مکان کے ساتھ ہی ایک مکان
میں ٹھہرے تھے۔ اس پر ایک بورڈ آویزاں تھا۔ جس پر لکھا ہوا تھا مہمان خانہ
دارالعلوم ۔ اور بھی خاصی تعداد میں مہمان تھے۔ ہم جب کھانا کھاتے تو حضرت
شیخ الہند ہمارے درمیان گھومتے رہتے ۔ یہ غلط ہے کہ مولانا محمد علی مرحوم
اور حضرت سندھی نے ہمارا امتحان دیوبند میں لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا
امتحان مولانا سندھی، پنڈت لوئی اور متھرا سنگھ نے پنجاب میں لیا تھا اور امتحان
دینے کے بعد ہم دیوبند گئے تھے۔ یہ بھی غلط ہے کہ حضرت شیخ الہند نے ہمیں کچھ
ہدایات دی تھیں۔ حضرت شیخ الہند نے ہمارے لئے صرف دعا فرمائی تھی ۔
ہمیں ہدایات دینے والے ہمارے سربراہ یہ تینوں حضرات تھے جنھوں نے
ہمارا امتحان لیا تھا۔ دیوبند سے ہم دہلی بھی گئے تھے۔ وہاں پر گاندھی جی ۔
پنڈت موتی لال نہرو، ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر انصاری
سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں بنگال کے ایک نوجوان رام کشن سے بھی ملاقات
ہوئی تھی اور گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ بھی ہماری طرح ایک تربیتی کورس
چاٹگام میں پاس کر کے آیا ہے۔ بعد میں جب ہم برطانوی فوج میں ملازم ہو گئے
تو ایک دفعہ برما میں اُن سے ملاقات ہوئی تھی ۔ ان کی بٹالین برما سے واپس
کراچی آرہی تھی۔ اُس وقت تحریک ناکام ہو چکی تھی۔ ہم نے آپس میں مل کر
اپنی ناکامی پر چند آنسو بہائے اور جدا ہو گئے ۔ یہ صاحب پھر کبھی نہیں ملے۔
غرض ہم دہلی سے واپس آکر فوج میں بھرتی ہو گئے اور اپنا کام شروع کیا۔
لیکن ہم صرف اتنے کامیاب ہو سکے کہ بعض سنجیدہ فوجیوں کو جذبۂ حب الوطنی

سے متاثر کر سکے اور سرحد میں جب حاجی صاحب ترنگ زئی والوں نے انگریز سے جنگ شروع کی تو بعض اہم معاملات کی خفیہ اطلاع انھیں پہنچاتے رہے جس سے ان کو زبردست فائدہ پہنچا۔ جب ہم صوبہ سرحد سے چلے گئے تو انھیں نقصان اُٹھانا پڑا۔ جنگ کے اختتام پر بڑی مشکل سے فوج سے نام خارج کرایا۔ ح۔

خلاصہ یہ کہ ان تینوں شقوں کا مطلب ایک ہی تھا یعنی حقائق حرب کی سراغرسانی۔ خواہ محاذ جنگ کی جغرافیائی حقیقت ہو یا دشمن حکومت کے ارادوں اور پالیسیوں کی اور یا دشمن افواج کی طاقت کی۔ اور اکابرین تحریک نے انھیں باحسن وجوہ انجام دیا۔

منصوبۂ پنجم

عارضی حکومت کا اجمالی خاکہ

پانچویں منصوبے کا مطلب یہ ہے کہ حکومتِ عارضی کا اجمالی خاکہ جس کے تحت مناصب و عہدوں کا تعین ہو۔ ہر انقلابی جماعت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ انقلاب سے پہلے ہی مناصب و اختیارات کی قائدین و ارکان میں تقسیم ہو ورنہ تو ہر انقلابی کے دل میں اپنے ساتھیوں کے متعلق غصب حقوق کے شبہات رہیں گے جس سے کارکردگی کے جذبات میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو جائے گا اور قوائے عمل سست پڑ جائیں گے۔

۲ : پھر بسا اوقات کارکن اپنی طاقت کو بجائے دشمن کے اپنے ہی ساتھیوں کی اکھاڑ پچھاڑ اور کش مکش میں ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ اور یہ ضیاع بدگمانی کی وجہ سے لازمی ہو جاتا ہے۔ اور دشمن اس سے فائدہ اٹھا کر کامیاب ہو جاتا ہے۔

۳ : بعض دفعہ اسی بدگمانی کی بنا پر بعض کارکن دشمن سے مل جاتے ہیں اور اس سے تحریک کو زبردست نقصان پہنچتا ہے جس کی تلافی ناممکن ہو جاتی ہے۔ مزید برآں یہ کہ

۴ : تحریک کی کامیابی کی صورت میں اختلافات کے پیدا ہونے کا زبردست

خطرہ رہتا ہے۔ اور یہ اختلافات انقلاب کے فوراً بعد جب پیدا ہو جاتے ہیں تو انقلابی جماعت کا شیرازہ استحکامِ حکومت سے پہلے ہی بکھر جاتا ہے۔ اور اس کی کامیابی ناکامی اور فتح شکست سے بدل جاتی ہے۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ انقلاب ہوا اور انقلابی کامیاب بھی ہو گئے۔ لیکن انقلاب کے فوراً بعد پھر دشمن کامیاب ہو گیا۔ اور انقلابی شکست کھا کر نیست و نابود ہو گئے۔

چنانچہ اس تحریک کے رہنماؤں کو اس کی اہمیت کا احساس تھا۔ اور واقعی یہاں تو اس منصوبے پر عمل کرنے کی ضرورت اور بھی زیادہ تھی۔ اس لئے کہ یہاں ہندو مسلم کھچاؤ اور کشمکش پہلے سے موجود تھی۔ اس صورت میں اگر پہلے سے مناصب کا تعین نہ ہوتا تو نقصانات پہارگانہ کا احتمال اور قوی ہو کر یقین سے بدل جاتا اور تحریک کو سخت نقصان پہنچتا۔ آپ مولانا سندھی کے بیانات اور ذاتی ڈائری میں مہندر پرتاپ وغیرہ کے متعلق اسی ہندو مسلم افتراقی ذہنیت کا بار بار ذکر پڑھیں گے۔ باوجود پیش بندی کے جب یہ حال ہے تو خدانخواستہ اگر یہ تجویز تقسیم مناصب عمل میں نہ آئی ہوتی تو معلوم نہیں کیا کچھ ہوتا۔ اب تحریک کامیاب نہیں ہوئی تو کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ہندو مسلم اختلافات کے سبب ناکام ہوئی۔ بہر حال تقسیم مناصب و حکومت موقت (عارضی حکومت) کا نقشہ یہ تھا۔ ایک اعلیٰ اختیارات کی حکومت جس کے ماتحت سب نظام حکومت ہو اور پورے اختیارات صرف اسی کو حاصل ہوں۔ اس میں ایک مسلمان اور دو ہندو رکن

ہوں گے مسلمان رکن تو حضرت شیخ الہند رح تھے افسوس کہ ہندو ارکان کے نام معلوم نہیں ہو سکے صرف سی آئی ڈی کے کاغذات سے گاندھی جی کے نام کا پتہ چلتا ہے۔ اس کونسل کے ماتحت ایک صدر (مہندر پرتاپ) اور ایک وزیر اعظم (مولانا برکت اللہ) اور ایک وزیر مملکت (مولانا سندھی) اور باقی اُن کے ماتحت کابینہ ہو گی۔ فوجی مناصب میں ایک کمانڈر انچیف (مولانا شیخ الہند رح) اور ۱۲ جنرل۔ اور باقی میجر و کرنل وغیرہ کے مختلف عہدے اُن کے ماتحت ہوں گے۔ پوری تفصیل رولٹ رپورٹ اور خفیہ کاغذات سی آئی ڈی میں ہے۔

منصوبۂ ششم

اندرونِ ملک مراکز بغاوت کا قیام

چھٹے منصوبے کے تحت اندرونِ ملک بغاوت کا قیام عمل میں لانا تھا جن میں
۱: رضاکاروں کی بھرتی ۲: عوام میں جذبۂ انقلاب کی خفیہ تبلیغ اور
۳: سنجیدہ دماغوں کو اس وقت نظم ونسق سنبھال لینے کے لئے آمادہ کرنے
کا کام کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک ہیڈ کوارٹر اور آٹھ شاخیں
قائم کی گئیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے: ہیڈ کوارٹر دہلی میں تھا جس میں مولانا شیخ الہند رح
مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد، مولانا سندھی، مسٹر گاندھی، ڈاکٹر
انصاری، پنڈت موتی لال، لالہ لاجپت رائے، راجندر پرشاد وغیرہ حضرات
کام کرتے تھے۔ اُن کی ہدایات پر ملک کے اندر اور باہر ہر کام انجام پذیر ہوتا
تھا۔

۱: راندیر (سورت، گجرات وبمبئی) کا مرکز تھا۔ یہاں مولانا ابراہیم کاوی
احمد بزرگ۔ پنوں پٹیل وغیرہ کام کرتے تھے۔ مولانا ابراہیم صاحب امیر
تھے۔

۲: پانی پت کا مرکز۔ یہاں مولانا احمد اللہ صاحب کی سرپرستی میں اضلاع یو۔پی

کا کام کیا جاتا تھا۔ مولانا احمد اللہ صاحب امیر تھے۔ آخر انگریز سے معافی مانگی تھی

۳ : لاہور پنجاب کا مرکز تھا۔ یہاں مولانا محمد احمد صاحب چکوالی مولانا احمد علی کے امیر تھے۔ آخر انگریز سے معافی مانگ لی تھی۔

۴ : دین پور۔ ریاست بہاولپور کا مرکز تھا۔ یہاں مولانا ابو السراج غلام محمد صاحب سجادہ نشین امیر تھے۔ تین سال قید پا کر بھی مضبوط رہے۔

۵ : امروٹ (سندھ) یہ صوبہ سندھ و بلوچستان کا مرکز تھا۔ یہاں مولانا تاج محمود صاحب سجادہ نشین وامیر تھے۔ چار سال قید رہے اور مضبوط رہے۔

۶ : کراچی۔ شہر کراچی اور تعلقات لس بیلا وغیرہ کا مرکز تھا۔ یہاں امیر مولانا محمد صادق صاحب تھے۔ لس بیلا میں بغاوت کرائی۔ لڑائی ہوئی اور آخر آپ نے انگریز کو بہت کچھ نقصان پہنچایا۔ انجام کار گرفتار ہوئے۔ ایک سال قید تین سال ملک بدر رہے اور مضبوط رہے۔

۷ : اتمان زئی صوبہ سرحد شمالی کا مرکز۔ امیر عبد الغفار خاں صاحب تھے۔ زبردست کام کیا۔ گرفتار ہو کر کئی سال قید رہے اور مضبوط رہے۔

۸ : ترنگ زئی۔ مرکز آزاد قبائل تھا۔ مولانا فضل واحد صاحب مشہور پیر یہاں کے امیر تھے۔ ۴ سال انگریز سے لڑائی لڑی اور آخر تک مخالف رہے۔

(م) حضرت مدنی رح نے صرف ان آٹھ مراکز کا ذکر کیا ہے لیکن تعجب ہے کہ بنگال اور آسام کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ یہاں حضرت شیخ الہند رح کے لاکھوں مرید تھے اور یہاں کے لوگوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ خود بنگال کے کئی قائد بیرونی مراکز میں کام کرتے رہے تھے اور یہاں سے مالی امداد بھی

کارکنوں کو زیادہ ملتی رہی۔ لیکن بایں ہمہ حضرت مدنی نے یہاں کے کسی مرکز کا ذکر نہیں کیا۔ غالباً حضرت کو یہاں کے مراکز کی تفصیل کا علم نہ ہوا ہو اس لئے ذکر نہ کیا۔ پھر شمال مغربی سرحد کے قبائل نے بڑھ کر حصہ لیا لیکن ان کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ بنگال کے مرکز کا ذکر مجھ سے بھی باوجود بسیار کوشش کے تفصیلاً نہ ہو سکا۔

مجھ سے ڈابھیل (سورت) میں ایک بنگالی طالب علم ہدایہ آخرین پڑھا کرتا تھا۔ میں اس کی ذہانت و نجابت سے بیحد متاثر ہوا۔ نوجوانی کا زمانہ اور پھر تقویٰ و طہارت کا یہ عالم کہ بڑے بڑے علماء بھی اس درجے پر رشک کریں۔ اختتام سال پر وہ دیوبند میرے ساتھ ہی آیا۔ سفر کے دوران اس نے بتایا کہ مجھے وہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اس لئے کہ حضرت مدنی رح میرے والد کے دوست ہیں۔ میرے والد صاحب انتقال فرما چکے ہیں۔ اور آپ حضرت شیخ الہند کے خلیفہ تھے اور ڈھاکہ کے مرکز تحریک ریشمی رومال کے امیر تھے۔ میں نے اس سے تفصیلات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس سے تہی دست تھا۔ اس لئے کہ تحریک کے وقت تو وہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا صرف والد سے سنی سنائی باتیں تھیں جو قابلِ اعتبار نہ تھیں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم دیوبند دارالعلوم میں داخلہ کے بعد اپنے والد کے خطوط اور تحریریں وغیرہ منگوا دو تو مجھے فائدہ ہوگا۔ اس نے مجھے چھ عدد خطوط منگوا دیئے جو حضرت شیخ الہند نے اس کے والد کے نام لکھے تھے۔ ان کا اسمِ گرامی مولانا یاسین احمد تھا۔ خطوط سے تحریک کے متعلق تو کچھ نہ معلوم ہو سکا لیکن اتنا پتہ چلا کہ آپ حضرت شیخ الہند کے مرید و خلیفہ تھے۔ اور حضرت شیخ ان کا احترام کرتے تھے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت شیخ نے اُن کے ذمے [illegible] اہم امور کئے ہوتے تھے جن

کے متعلق سخت تاکید درج تھی۔ ان کے خصوصی نوٹ ان کے زیر مطالعہ کتاب (حجۃ اللہ) کے ایک نسخہ پر درج تھے۔ وہ اس طالب العلم نے منگوا دی تھی۔ اُن سے پتہ چلا کہ آپ گرفتار ہو کر چھ سال جیل میں رہے۔ اور یہ کتاب ان کے مطالعے میں رہی۔ اس پر گرفتاری اور رہائی کی تاریخیں بھی درج ہیں۔ ایک جگہ یہ عبارت بھی عربی زبان میں درج تھی کہ تاریخ ۱۹۔ فروری ۱۹۱۵ء کے دن کو یاد رکھو اس تاریخ کو اگر میں لاپتہ ہو جاؤں یا کوئی اور حادثہ پیش آجائے تو میری زندگی کی امید نہ رکھنا۔ اور میری بیوی کو نکاح کی اجازت ہوگی۔ اور میری جائداد میں سے آٹھواں حصہ لے کر جہاں چاہے چلی جائے۔ اور میری لڑکی کو جائداد کا نصف حصہ دے کر میری بہن یا ماں کی تربیت میں رکھا جائے۔ اور اس کے اپنے حصہ جائداد سے اس کی کفالت کی جائے۔ جائداد کا چھٹا حصہ میری ماں کو دے دیا جائے۔ اور باقی میرا چچا لے لے۔ میری ملک ایک مکان پختہ مزرعہ زمین ۸۰ ایکڑ، سونا بصورت زیورات ۵ تولے، باقی پارچہ جات غیر زنانہ وظروف خانگی ہیں۔ ۵ تولے سونا جو ان پندرہ تولے بالا کے علاوہ ہے وہ بحق مہر میری بیوی کی ملک ہے۔ میں اگر زندہ واپس بھی آ گیا تو سمجھو کہ میری یہ تحریر میری بیوی کے لئے طلاق معلق کا درجہ متصور ہوگی۔ ورنہ وہ بیوہ شمار ہوگی۔ عوام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ جب یہ تاریخ آجائے تو حکم امیر کا انتظار کریں، بغیر حکم کے کوئی توڑ پھوڑ دنگا وفساد نہ کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فساد پسند نہیں کرتا۔ اور اگر حکم امیر کسی قربانی کے لئے مل جائے تو کوئی دریغ نہ کریں۔

المحرر: ریاض احمد۔ ۲ مارچ ۱۹۱۴ء

اس تحریر سے پوری بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ یقیناً ڈھاکہ مرکز کے امیر تھے اور یہ نوٹ وصیت تھی۔ اور مذکورہ تاریخ انقلاب ریشمی رومال کی تاریخ تھی۔ اور آپ کو ۱۹۱۳ء کے اوائل میں اس کا علم ہو چکا تھا۔ جیسا کہ آگے آئے گا کہ ریشمی رومال میں بغاوت اور بیرونی حملہ کی تاریخ ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء مقرر کی گئی تھی۔ اس مذکورہ بالا تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ اس تاریخ کا تعین دہلی مرکز نے حضرت شیخ الہند کی روانگی حج سے پہلے آپ کی موجودگی میں کر دیا تھا۔ اور پھر باقی سب انتظامات اس کے مطابق ہوتے رہے۔ اور اس کی اطلاع ہر ایک برانچ کو اسی وقت کر دی تھی۔ لیکن حکم ثانی کا انتظار بھی لازمی قرار دیا گیا تھا۔ جیسا کہ مذکورہ بالا تحریر میں اس کی تصریح ہے۔ یہ انتہائی احتیاط تھی تاکہ سب انتظامات مکمل کر لینے کے بعد دوبارہ احکام اپنی برانچوں کو صادر کئے جائیں گے اور ان کے مطابق عمل ہوگا کہیں ایسا نہ ہو کہ اُدھر مرکز تو کسی وجہ سے عمل شروع نہ کر سکے اور کوئی برانچ بے وقت اقدام کر کے نقصان اٹھائے۔ چنانچہ آخر واقعی مرکزی طاقت کو اپنا عملی پروگرام ترک کرنا پڑا۔ ایسے حالات میں ہر برانچ کو حکم ثانی کا پابند کرنا ضروری تھا۔ تاکہ یہ مقدس جہاد فساد کی صورت اختیار نہ کر لے۔ اللہ اکبر حسنِ تدبیر ملاحظہ ہو۔ شمالی کوہستانی قبائل نے بھی تحریک میں حصہ لیا اور ان کا مرکز اوگی ضلع ہزارہ تھا۔ جب اصل تحریک ناکام ہو گئی تو ان لوگوں نے اپنے طور پر جہاد شروع کیا۔ اور انگریز کو بہت پریشان کیا۔ چنانچہ ہمارے ضلع ہزارہ کے بہت سے حضرات جو اس تحریک اور پھر جہاد میں مصروف عمل رہے وہ اب تک زندہ ہیں۔ ان سے میں نے فرداً فرداً تفصیلات معلوم کیں لیکن

سب سے زیادہ تفصیل ایک دوست نے جو کہ عالم بھی تھے اور میرے ساتھ ان کے
بہ زمانۂ طالب علمی دوستانہ تعلقات تھے۔ حالانکہ عمر کے لحاظ سے وہ میرے
بزرگ تھے لیکن چونکہ وہ اس وقت آخر عمر میں کتابیں پڑھ رہے تھے اور مجھ
سے پیچھے تھے اور مجھ سے استفادہ بھی کرتے تھے اس لئے ان کے تعلقات کی
نوعیت دوستانہ ہوگئی۔ انھوں نے حالات بتائے یہ خود تنداہاڑ کے باشندہ تھے۔
اس تحریک کا مرکز ادگی اور صدر مقام اگرور تھا۔ اور اس کے تحت سیاہ کوہ۔
تنداہاڑ۔ الائی۔ کوہستانِ صغیر، کوہستانِ کبیر۔ دلیشیاں کے قبائل میں باقاعدہ
جہاد کی تبلیغ ہوتی تھی۔ یہ غلط ہے کہ مرکز کے امیر مولانا محمد اسحٰق صاحب مانسہروی
تھے۔ وہ صرف مرکز دہلی سے ہدایات لینے کا ذریعہ تھے۔ اور ان کے سپرد کام یہ تھا
کہ ہدایات لے کر مرکزی طاقت کے سامنے رکھیں۔ درحقیقت مقامی مرکزی امارت
تین علماء کی کونسل کے پاس تھی۔ اور یہی حضرات مقامی مرکزی طاقت اور مرکزی امیر
تھے۔ ان میں ایک مولانا محمد اسحٰق صاحب بھی تھے۔ ان لوگوں نے پہلے تو دہلی کی
مرکزی طاقت کا انتظار کیا کہ وہ کوئی حکم بھیجے تو اس پر عمل کیا جائے لیکن جب
مرکزی لیڈر گرفتار کر لئے گئے تو مقامی مرکزی کونسل نے از خود جہاد کا حکم دے
دیا۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ مولانا محمد اسحٰق صاحب بہ ظاہر غیر متعلق رہ کر انگریزی علاقہ
سے نوجوانوں کی ترسیل اور مالی امداد کی بہم رسانی کا کام کریں۔ اور آزاد قبائل
کھلم کھلا حملہ کریں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ انگریزی علاقہ سے بعض نوجوان بھی جہاد
میں شرکت کے لئے پہنچ گئے۔ اور مالی امداد بھی پہنچتی رہی خصوصاً اسلحہ کی امداد
محمود شاہ صاحب دوگے (ایک جگہ کا نام ہے) والے نے بہت زیادہ کی۔ یہاں سے

انگریزی فوجوں پر بعض دشوار گذار راستوں میں حملے کر کے ان سے ہتھیار چھین کر وہاں محاذ جہاد پر بھیجتے تھے۔ اس امداد کی پاداش میں آخر انگریز نے ۱۹۲۳ء میں محمود شاہ صاحب کو اپنے مکان میں بذریعہ گورا فوج محاصرہ کرکے شہید کر دیا۔ میں ان دنوں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ جب جہاد کا اعلان سُنا تو تعلیم چھوڑ کر میں بھی جہاد میں شریک ہو گیا۔ ہم راتوں کو شبخوں زیادہ مارتے تھے۔ اور اس میں کامیاب رہتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ جب ہم نے کھیل کے علاقے سے ہو کر حملہ کیا تو رات کی تاریکی میں میرے ایک گولی لگ گئی۔ مجھے میرے ساتھی اٹھا کر ایک محفوظ مقام میں لے آئے۔ ہمارے رضا کار اپنے گھروں سے تین تین چار چار دن کا کھانا، کچّی رسد اور بعض دفعہ پکی ہوئی روٹیاں ساتھ لے کر محاذ پر آتے تھے۔ اور جب رسد ختم ہو جاتی تو پھر اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتے اور اس دَور میں دوسرا قبیلہ آجاتا۔ ایسے ہی قبائلیوں نے دو سال انگریز سے ٹکر لی" میرے دوست کا بیان یہاں تک ان کے الفاظ میں ختم ہو گیا۔ میں نے مولانا محمد اسحٰق سے بھی ملاقات کر کے حالات دریافت کئے۔ انھوں نے بھی اسی قسم کے واقعات بتائے۔ آپ کو انگریز نے پہلے ۱۹۱۶ء میں تین سال کے لئے قید کیا۔ اور پھر ۱۹۲۳ء میں گیارہ سال کے لئے ضلع بدر کر کے راولپنڈی میں پہلے دو سال جیل میں قید اور پھر نظر بند رکھا۔ چنانچہ آپ اب ضعیف العمری کی حالت میں راولپنڈی میں گوشہ نشین ہیں، بہرحال اب میری اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ملک میں ایک ہیڈ کوارٹر اور دس برانچیں تھیں۔ واللہ اعلم!

منصوبۂ ہفتم

بیرونِ ملک امدادی مراکز کا قیام

اس منصوبے کے تحت بیرونِ ملک میں امدادی مراکز قائم کئے گئے۔ جہاں رضاکاروں کی بھرتی اور مالی اسلحہ کی فراہمی کا کام ہوتا تھا۔ یہ غلط ہے کہ ہیڈ کوارٹر مدینۂ منورہ میں تھا جیسا کہ رولٹ رپورٹ میں ہے۔ ان کو غلط رپورٹ دی گئی ہے۔ حقیقتاً ہیڈ کوارٹر کابل (افغانستان) میں تھا۔ جہاں پہلے مہندر پرتاپ اور پھر مولانا سندھی اور مہندر پرتاپ دونوں اکٹھے رہ کر کام کرتے رہے۔ اس کی پانچ برانچیں تھیں (۱) مدینہ منورہ۔ جہاں مولانا حسین احمد صاحب اور پھر مولانا خلیل احمد صاحب کام کرتے رہے۔ (۲) استنبول (۳) قسطنطنیہ۔ (۴) انقرہ (۵) برلن۔ ان مقامات میں مختلف حضرات کام کرتے رہے خصوصاً برلن میں ہردیال صاحب نے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ ان کی کوششوں سے ہی جرمنی ترکی اتحاد عمل میں آیا۔ اور جرمنی حکومت ہندوستانیوں کی مدد کے لئے آمادہ ہوئی کہ ہندوستان پر حملہ کرکے آزاد کرانے کے بعد واپس ہو جائے گی۔

کابل کے ہیڈ کوارٹر کو تو اتنی کامیابی ہوئی کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے حبیب اللہ خاں امیر افغانستان جب رؤسائے افغانستان کا اس مشورے کے لئے جرگہ بلاتا ہے کہ انگریز کے ساتھ لڑا جائے یا نہیں، تو بجز امیر حبیب اللہ خاں اور ان کے لڑکے عنایت اللہ خاں کے باقی سارا مجمع، مع امان اللہ خاں اور نصر اللہ خاں

پسران حبیب اللہ خاں کے سب کے سب امراء قبائل کی متفقہ رائے پر متفق تھے
کہ لڑائی کی جائے چنانچہ حبیب اللہ خاں حیران رہ جاتا ہے اور اپنے شاہی
اختیارات استعمال کر کے کھلی جنگ سے ہٹ کر ایک نرم رائے پر مجمع کو مجبور کرتا
ہے۔ درحقیقت یہ اُن بزرگوں کی جدوجہد کا نتیجہ تھا جو کئی سال سے اس ہیڈ کوارٹر
میں کام کر رہے تھے۔ اور جب مولانا سندھی مرحوم افغان حدود میں بلا پاسپورٹ
داخل ہوتے ہیں تو قندھار میں ہی ان کو افغانستان کا سپہ سالار نادر خاں آپ سے
ملتا ہے اور آپ کا نام سننے کے بعد بڑا خوش ہوتا ہے۔ مولانا سندھی کو معلوم ہوا
کہ وہ پہلے سے آپ کے نام سے واقف تھا۔ اور یہ بھی پتہ چلا کہ آپ کے افغانستان
تشریف لانے کی پہلے سے اطلاع مل چکی تھی اور وہاں کے بڑے بڑے افسر آپ
کی آمد کے منتظر تھے۔ یہ سب کچھ قائدین تحریک کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ریشمی خط
کے پکڑے جانے اور تحریک کے ناکام ہو جانے کے بعد جب ان قائدین افغانستان
ہیڈ کوارٹر کو گرفتار کر لیا جاتا ہے تو اس وقت ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ امیر
حبیب اللہ خاں انگریز سے ملا ہوا ہے تو یہ لوگ نظربندی کی حالت میں ہی امیر کے
روڑے کو راستے سے ہٹانے کے لئے ایک تحریک افغان افسروں کے اندر چلاتے
ہیں جس پر امیر حبیب اللہ خاں کو قتل کر کے حکومت پر امان اللہ خاں کا قبضہ
کرایا جاتا ہے جو برسرِ اقتدار آتے ہی ان لوگوں کو رہا کر کے اپنا مقرب بناتا ہے
اور پھر اُن کے مشورے سے انگریزی حکومت پر حملہ کر کے ۲۳۔ اگست ۱۹۱۹ء
کو افغانستان کی آزادی کا اعلان کرتا ہے۔ یہ سب کارنامے اس بات کی دلیل
ہیں کہ افغانستان کے ہیڈ کوارٹر کے قائدین کا اثر ورسوخ افغان حکومت پر بہت

زیادہ تھا۔

منصوبۂ ہشتم

دوسری حکومتوں کو ترکی کا حمایتی بنانا

اس آٹھویں منصوبے اور اسکیم کے تحت دوسری حکومتوں کو ترکی کا حمایتی بنانا یا کم از کم غیر جانب دار بنانا مقصود تھا۔ چنانچہ اس کے لئے دہلی میں ایک مشورہ ہوا کراچی مقدمے کے دوران مولانا محمد علی نے مجھے خود بتایا کہ اس مشورے میں میری رائے تھی کہ امریکہ بھی ہماری حمایت کرے گا اور ترکی حکومت کا ساتھ دے گا۔ اس لئے کہ ہماری طرح وہ بھی انگریز کے غلام رہ چکے ہیں۔ اور جدوجہد آزادی کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن حضرت شیخ الہند کی رائے تھی کہ امریکہ ہمارا حمایتی تو کجا غیر جانب دار بھی نہیں رہے گا، بلکہ الٹا انگریز کا طرف دار اور مددگار و معاون ہوگا۔ باقی ممبرانِ شوریٰ نے حضرت شیخ کی رائے کی تائید کی۔ صرف مولانا آزاد نے فرمایا کہ غیر جانب دار رہنے کی توقع ہے۔ لیکن جب جنگِ عمومی شروع ہوئی تو امریکہ بھی انگریزوں کا معاون بن کر میدانِ جنگ میں کود پڑا۔ حضرت شیخ کی بصیرۃ اور معاملہ فہمی کی مجھے اس وقت قدر معلوم ہوئی۔ خیر امریکہ اور فرانس سے تو قطعاً ترکی کی حمایت کی اُمید نہ تھی لیکن پھر بھی یہاں مشن بھیج کر کوشش کی گئی کہ کم از کم یہ غیر جانب دار تو رہیں۔ یہ کوششیں بالکل ناکام نہیں ہوئیں بلکہ ان دونوں ممالک کی پبلک پر بڑا اثر ہوا۔ اور منصف مزاج عوام

نے جنگِ عمومی کے دوران صدائے انصاف بلند کی جس سے ترکی کو فائدہ ہوا۔
اصل کام جو اس اسکیم میں طے ہوا تھا وہ تھا جرمن اور روس کو ترکی کا مددگار بنانا۔
چنانچہ برلن میں مہندر پرتاپ نے مسلسل تین سال رہ کر اس کام کو سرانجام دیا۔
ہردیال اور مولانا برکت اللہ صاحب بھی ان کی امداد کرتے رہے اور آخر جرمنی
ترکی اتحاد عمل میں آیا۔ یہ مشن بے حد کامیاب رہا۔ اور کیپٹین ہنٹس جو جرمنی حکومت
میں اثرورسوخ کے مالک تھے انھوں نے اس اتحاد میں ہندوستانی مشن کی بڑی مدد
کی۔ اور آخر خود بہ نفس نفیس ہندوستان پر حملے کی تیاری کے سلسلے میں کابل تشریف
لائے اور یہاں بھی بڑے خلوص سے کام کیا۔ غرضیکہ جرمنی حکومت کی جانب سے
مطمئن ہو کر اب اسی مشن کو روسی اتحاد کے لئے احکام دیئے گئے۔ اور راجہ مہندر
پرتاپ برلن سے کابل تشریف لائے اور یہاں سے یہ کام شروع کیا۔ اس وقت
ہندوستان سے مولانا عبیداللہ سندھی بھی کابل پہنچ چکے تھے۔ ان دونوں کے
مشورے سے روس کو مشن بھیجے گئے۔ پہلا مشن ڈاکٹر مرزا محمد علی اور متھرا سنگھ
کی قیادت میں بھیجا گیا۔ یہ لوگ زار روس سے نہ مل سکے اور وہ الٹا ان کے خلاف
ہو گیا۔ اور ان کی گرفتاری کا حکم بھی دیا۔ مگر گورنر تاشقند کو یہ لوگ اپنا ہمنوا بنا
چکے تھے اور اسی کی کوشش سے یہ لوگ گرفتاری سے بھی بچ گئے۔ اور بالآخر
اسی کی مداخلت سے ان لوگوں نے اپنے نصب العین میں بھی کامیابی حاصل کی۔
حضرت سندھی فرماتے ہیں کہ یہ مشن بیکار ثابت نہیں ہوا۔ اور روسی و انگریزی اتحاد
میں خاصا رکاوٹ ثابت ہوا۔ جس کی تلافی کے لئے لارڈ کچنر کو خود سفر کرنا پڑا۔ روسی
انقلابیوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا نام ہے سونے کی چڑی۔ یہ ایک سونے

کی پیڑی پر کندہ کرایا گیا ہے۔ اس میں اس مشن کا ذکر ہے اور اس میں یہ بھی درج ہے کہ ہندوستانی انقلابی پارٹی کا ایک خط گورنر تاشقند کے نام اس مشن کے توسط سے گورنر مذکور کو بھیجا گیا۔ اور یہ بے حد موثر ثابت[1] ہوا۔ یہ غلط ہے کہ روسی مشن کو حکومت زار نے گرفتار کر کے انگریز کے حوالے کر دیا۔ درحقیقت جو مشن گرفتار ہوا وہ روس کے راستے جاپان جا رہا تھا۔ اور اس میں مسٹر عبدالقادر بی اے اور متھرا سنگھ تھے۔ انگریز نے متھرا سنگھ کو پھانسی دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور عبدالقادر کو قید کر دیا۔ غرضیکہ روس تو قدرے متاثر ہوا۔ اور جرمنی ترکی کا اتحاد مکمل ہو گیا۔

---

[1] ایک دوسرا مشن زار روس سے ملنے میں کامیاب ہوا اور ایک خط سونے کی پیڑی پر کندہ کر کے اس کو دیا۔ جو کہ دوستی کے بعد زار نے انگریز کو دیا۔ اور رولٹ رپورٹ میں درج ہے۔

منصوبۂ نہم

حملہ کرنے کے راستوں کا تعین اور اُن کا تحفظ

اس نویں منصوبے میں حملہ آور فوجوں کے حملہ کرنے کا تعین اور ان کا تحفظ مقصود تھا۔ حملہ تو ترکی فوجوں نے کرنا تھا۔ راستے میں ایران اور افغانستان پڑتے تھے۔ ایران تو حکومت برطانیہ کے زیر اثر اور اس کا دستِ راست اور ترکی کا مخالف تھا۔ لہٰذا اُس سے تو راستہ دینے کی توقع نہ تھی۔ اس لئے تحریک کے قائدین نے کوئی روابط ہی قائم نہیں کئے۔ البتہ افغانستان کا عیور پٹھان انگریز کا دشمن اور بدخواہ تھا۔ گو مجبوراً افغان حکومت انگریز کے زیر اثر تھی۔ اور افغانستان انگریزی حکومت کی ایک ریاست تصور ہوتا تھا لیکن بایں ہمہ دل سے کوئی بھی انگریز کا خیر خواہ نہ تھا۔ یہاں کامیابی کی امید تھی اس لئے یہاں کام کیا گیا اور واقعی کامیابی ہوئی۔ امیر حبیب اللہ خان کمزور دل کا انسان تھا، اس لئے وہ تو نہیں چاہتا تھا کہ اس کا ملک جنگ کا مرکز بن جائے چنانچہ اس نے فیصلے کے لئے اپنے سول اور فوجی افسروں اور قبائلی سرداروں کا ایک جرگہ بلایا اور پھر اُن کے سامنے یہ رائے رکھی تو سب افسر و رؤسا قبائلی اور اس کے دونوں بیٹے امان اللہ خاں و نصر اللہ خاں جنگ پر آمادہ تھے اور سب کی یہ رائے تھی کہ ہمیں ترکی کے ساتھ مل کر لڑنا چاہئے اور ملک کو انگریز کی غلامی سے نجات دلانی چاہئے۔ صرف ایک امیر صاحب خود اور اُن کا لڑکا سردار عنایت اللہ

خاں بعض وجوہ کی بنا پر جنگ کے خلاف تھے۔ لیکن قومی دباؤ کے تحت امیر حبیب اللہ خاں نے ایک بین بین یعنی درمیانی راہ نکالی کہ بعض پہاڑی قبائل کے علاقوں سے ترکی فوج گزر کر ہندوستان پر حملہ کرے اور ان پہاڑی راستوں کا تعین بھی کر دیا۔ اور ہم انگریز سے کہیں گے کہ یہ قبائل باغی ہو گئے ہیں اور ہم مجبور ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ سرکاری فوج تو کوئی حصہ نہ لے البتہ رعایا کو اختیار ہے کہ از خود رضاکارانہ طور پر جانی اور مالی خدمات انجام دیں مقصد یہ تھا کہ اگر عین موقع پر انگریز کا پلہ بھاری نظر آیا تو اس کے ساتھ ہو کر ترکی فوجوں کو روک دیں گے۔ اور اگر ترکی کا غلبہ نظر آیا تو ان کے ساتھ ہو کر انگریز سے باغی ہو جائیں گے۔ یہ دو رُخی پالیسی ان کی کمزوری کا نتیجہ تھی۔ انقلابی لیڈروں کو امان اللہ خاں اور نصراللہ خاں نے تسلی دی کہ حکومت کا نظم و نسق ہاتھ میں ہے لہٰذا اتنی اجازت کو کافی سمجھیں اور جب ترکی فوج یہاں پہنچ جائے گی تو رعایا اور فوج کے دباؤ سے ہم امیر کو بغاوتِ انگریز پر آمادہ کریں گے ورنہ یہ روڑا راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔ آپ اطمینان سے اپنا کام جاری رکھیں۔ چنانچہ یہ مرحلہ اس طرح کامیاب ہوا اور طے پایا کہ ترکی فوج کابل کے راستے سے قبائلیوں کو اپنے ساتھ ملا کر چار محاذوں سے حملہ کر دے۔

۱: قلات و مکران کے قبائل ترکی فوج کی قیادت میں کراچی پر حملہ کریں۔

۲: کوئٹہ کے محاذ پر غزنی و قندھار کے قبائل ترکی فوج کی قیادت میں حملہ کریں

۳: پشاور کے محاذ پر درۂ خیبر سے مہمند و مسعودی قبائل کو ساتھ لے کر ترکی فوج حملہ کرے۔

۴: ادگی کے محاذ پر کوہستانی قبائل کو ساتھ لے کر ترکی فوج حملہ آور ہو۔ ادھر ہر محاذ پر ایک ایک انقلابی لیڈر پہلے سے کام کر رہا تھا۔ قلات کے محاذ پر مولانا محمد صادق صاحب کراچوی۔ کوئٹہ کے محاذ پر حافظ تاج محمود صاحب سندھی جو کہ پیر پگاڑو کے سلسلے کے قائد تھے۔ درۂ خیبر کے محاذ پر حاجی ترنگ زئی شریف والے۔ ادگی کے محاذ پر مولانا محمد اسحٰق صاحب۔

اگر روس ساتھ دیتا تو نیپالی قبائل کی معیت میں نیپال کے محاذ سے حملہ کیا جاتا۔ نیپال میں پنڈت لوی صاحب پہلے سے کام کر رہے تھے۔

منصوبۂ دہم

ہندوستان کے اندرونی محاذوں پر بغاوت کا منصوبہ

اس منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ فوج جس وقت حملہ کرے اسی وقت ہندوستان کے اندرونی محاذوں پر بغاوت شروع ہو جائے۔ بیرونی حملہ اور اندرونی بغاوت دونوں بیک وقت عمل میں آئیں ایسا نہ ہو کہ تقدیم و تاخیر ہو جائے اور دشمن کی طاقت فرداً فرداً ہر ایک مخالف کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے جیسا کہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے حضرت شیخ الہندؒ نے الوزیر پاشا سے آخری خط میں لکھوا دیا تھا کہ باقی معاہدات ہندوستانی انقلابیوں سے بذریعہ محمود الحسن آفندی طے ہو چکے ہیں۔ صرف افغان حکومت سے معاہدے کی یہ آخری تحریر ہے۔ اگر افغان حکومت ہمیں راستہ دینے پر راضی ہو جائے تو افغانستان کے محاذ والے حملہ کی تاریخ کا تعین کر کے ہمیں اطلاع دیں تاکہ ہم اسی تاریخ کو حملہ کا انتظام کریں۔ اور حملہ سے صرف دس دن پہلے ہماری فوج افغانستان پہنچ جائے گی۔ یوں ایسی ریشمی خط میں افغان حکومت سے معاہدہ کر کے افغانستان کے ہیڈ کوارٹر نے ۱۹۔ فروری ۱۹۱۷ء کی تاریخ کا تعین لکھ دیا تھا۔ یہ ریشمی خط مولانا شیخ الہند کو مدینہ منورہ میں ملنا تھا اور اس کے مطابق ترکی حکومت سے بات چیت کو آخری شکل دے کر ایک ماہ پہلے یکم جنوری ۱۹۱۷ء کو کابل ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دینی تھی۔ اور پھر کابل کے ہیڈ کوارٹر نے ہندوستان کے ہیڈ کوارٹر دہلی کو

یکم فروری ۱۹۱۵ء تک حملے کی تاریخ سے مطلع کرنا تھا۔ اس کے بعد ۹۔ فروری کو ترکی فوجوں نے افغانستان پہنچنا تھا۔ اور پھر ۱۹۔ فروری کو حملہ کر دینا تھا۔ اور اسی تاریخ کو ہندوستان کے ہر محاذ نے اپنے اپنے علاقوں میں علم بغاوت بلند کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت شیخ الہند ابتداءً مدینہ منورہ ٹھہر گئے۔ ارادہ یہی تھا کہ ترکی حکومت سے آخری بات چیت اور تاریخ مقررہ پر حملے کا قطعی فیصلہ لے کر افغانستان جائیں گے بعد میں جب کابل ہیڈ کوارٹر کے جواب ملنے سے مایوس ہو گئے تو سمجھ گئے کہ کوئی حادثہ پیش آچکا ہے مجھے جلد تر کابل پہنچنا چاہیے۔ لیکن اب حالات دگرگوں ہو چکے تھے۔ اور حادثہ پیش آچکا تھا ریشمی خط پکڑا جا چکا تھا، اور انگریز نے افغانستان کے سب راستے بند کر دیئے تھے۔ اب وہاں پہنچنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی چنانچہ مجبوراً وہاں حجاز ہی میں رہنا پڑا۔ اور وہاں سے ہی گرفتار کئے گئے۔ تقدیر تدبیر پر غالب آئی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز نے ریشمی خط پکڑ لینے کے بعد ہندوستان کے انقلابی لیڈروں کو ۱۹۔ فروری سے پہلے ہی گرفتار کر لیا۔ اور حبیب اللہ خاں پر دباؤ ڈال کر کابل ہیڈ کوارٹر کے لیڈروں کو بھی ۱۹۔ فروری سے پہلے ہی گرفتار کرا دیا۔ اور بایں ہمہ پھر بھی ۱۹۔ فروری کو ہندوستان کی سرحدوں پر بھی اور اندرون ملک بھی زبردست انتظامات کئے۔ تاکہ کہیں کوئی حادثہ نہ پیش آجائے لیکن اب تو حادثہ پیش آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ رولٹ رپورٹ میں ان انتظامات کے متعلق اجمالی اشارے درج ہیں کہ گورنمنٹ نے بروقت احتیاطی تدابیر اختیار کیں جن کی وجہ سے کوئی گڑبڑ رونما نہیں ہوئی۔ یہ تفصیلات ہم نے خفیہ کاغذات

سی۔آئی۔ڈی اور رولٹ رپورٹ سے لی ہیں۔ بعض باتیں اُن بیانات سے لی گئی ہیں جو کہ مصر میں فوجی عدالت نے حضرت شیخ الہند کو پڑھ کر سنائے کہ ہندوستانی سی۔آئی۔ڈی کے یہ بیانات ہیں۔ اور کچھ معمولی حالات آپ نے بعض بزرگوں کی زبانی سنے۔ یہ دس تجویزیں یا دس منصوبے تحریک شروع کرنے کے لئے عمل میں لائے گئے تھے۔ اب ہم اصل واقعے کا ذکر کرتے ہیں۔

واقعہ مرکزیہ یا سرگزشت محوری

اب[۱] ہم اصل واقعے کو بیان کرتے ہیں جو کہ ان سب واقعات اور سرگزشتوں کا مرکز و محور ہے اور جس کے نام سے یہ کتاب موسوم ہے یعنی واقعہ تحریک ریشمی رومال لیکن اس واقعے کو سمجھنے کے لئے آپ ان دس منصوبوں کی تصویر ذہن میں رکھئے۔ تاکہ اصل ماجرا کے سمجھنے اور ذہن نشین کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ ان منصوبات عشرہ کا خلاصہ اور اجمالی خاکہ صرف اتنا ہے کہ مقصد تو تھا ہندوستان کی آزادی؛ اس کے لئے ایک مرکزی جماعت بنائی گئی جس کے امیر و سربراہ حضرت شیخ الہند تھے۔ اور اس کا مرکز پہلے دیوبند پھر دہلی تھا۔ اس کا نام پہلے ثمرۃ التربیۃ اور پھر جمعیۃ الانصار تھا۔ اس مرکزی جماعت نے ایک انقلاب برپا کرنے کا ارادہ کیا کہ اندرون ملک بغاوت کرائی جائے اور بیرون ملک شمال مغربی سرحد پر قبائل سے کسی طاقتور حکومت کی زیر نگرانی حملہ کرایا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ترکی[۲] حکومت کی مرکزی طاقت ترکی نوجوان یعنی انور پاشا وغیرہ سے معاہدہ ہوا کہ وہ افغانستان کے راستے سے فوجیں گزار کر قبائل کو ساتھ ملا کر ہندوستان پر حملہ کریں۔

۱۔ تلک عشرۃ کاملۃ (منصوبات عشرہ پر طائرانہ نگاہ)

اُس کے لئے افغان حکومت کو رضامند کرنا تھا۔ اور وہاں ایک ہیڈ کوارٹر قائم کر کے اُس کو رضامند کر لیا گیا۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس وقت افغانستان اور ترکی کی سرحدیں ملتی تھیں۔ اُس وقت کا جغرافیہ جنگ اور تھا اور اب تو نقشہ ہی بدل چکا ہے۔ بہر حال اسی مقصد کو پورا کرنے اور تکمیل تک پہنچانے کے لئے دس اسکیمیں بنا کر اُن پر عمل کیا گیا جن کو ہم منصوباتِ عشرہ یعنی دس منصوبوں سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔ اُن کا خلاصہ ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔ تاکہ گزشتہ تفصیل کا نتیجہ آپ کے ذہن میں رہے اور اصل واقعے کے سمجھنے میں مدد دے۔

۱ : اندرونِ ملک ہندو مسلم اتحاد کرایا گیا۔ اور دونوں قوموں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے آمادۂ بغاوت کیا گیا۔

۲ : قدیم تعلیم یافتہ طبقہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ گریجویٹ کو یکجا کر کے آمادۂ پیکار کیا گیا۔

۳ : بین الاقوامی دنیا کو یعنی جاپان، چین، برما، انڈونیشیا، فرانس اور امریکہ کو اپنا ہمنوا بنایا گیا۔

۴ : دشمن پر حملہ کرنے کے لئے نقشۂ جنگ تیار کیا۔ اور انگریزی سی۔ آئی۔ ڈی اور فوجوں میں اپنے نوجوان بھیجے گئے۔

۵ : انقلاب کے بعد کے لئے عبوری حکومت کا خاکہ بنایا گیا جس میں ہندو مسلم دونوں کو مساوی حقوق دیئے گئے۔

۶ : اندرونِ ملک خفیہ مراکز قائم کئے گئے جہاں بغاوت کے لئے نوجوان طاقت کو تیار کیا گیا۔

(۷) بیرونِ ملک یعنی کابل۔ انقرہ۔ استنبول قسطنطنیہ۔ برلن میں رضاکاروں کی بھرتی کے مراکز کھولے گئے۔

(۸) ترکی حکومت کا معاون جرمنی کو بنایا گیا اور روس کو مددگار بنانے کی کوشش کی گئی۔

(۹) حملے کے لئے قلات، کوئٹہ، درہ خیبر اور راوگی مقرر کئے گئے اور افغان حکومت سے راستے کی اجازت لی گئی۔

(۱۰) حملہ و بغاوت کے لئے ۱۹۔ فروری ۱۹۱۷ء کی تاریخ حضرت شیخ الہند، انور پاشا و جمال پاشا کے مشورے سے مقرر کی گئی۔

انقلاب کا فیصلہ

۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۴ء تک متواتر نو سال ان منصوبوں پر عمل ہوتا رہا جب یہ منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے تو اچانک جنگ عمومی شروع ہو گئی انقلابیوں کے لئے یہ سنہری موقع تھا چنانچہ انقلابی پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے بجائے دہلی کے دیوبند میں مجلس مشاورت منعقد کر کے یہ فیصلہ کیا کہ جلدی یعنی ۱۹۱۷ء میں ہی انقلاب کیا جائے۔ اس کے لئے تاریخ ۱۹ فروری مقرر کی لیکن اس کی توثیق ترکی حکومت کو کرنی تھی، فیصلہ ہوا کہ یہ عبوری تاریخ رہے اور اگر ترکی حکومت اس کی منظوری دے دے تو یہی پختہ ہو جائے گی۔ ورنہ جو تاریخ ترکی حکومت نے مقرر کی وہ پختہ سمجھی جائے گی۔ اس فیصلے کی اطلاع اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک انجمنوں کو کر دی گئی کہ اس تاریخ کے لئے تیاری کریں لیکن پختہ یقین کے لئے اطلاعِ ثانی کا انتظار کریں۔ شیخ البندرح کے مکان پر یہ فیصلہ ہوا۔ اس کے مطابق اب ایک اہم کام انجام دینا تھا وہ یہ کہ اب تک انقلابی اور ترکی حکومت کے درمیان بواسطہ نمائندگان معاہدے ہوئے تھے بلاواسطہ بالمشافہ ترکی افسروں اور انقلابی افسروں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ انقلابی حکومت کے صدر اور ترکی اتحادی حکومت کے صدر بالمشافہ بات چیت کر کے معاہدہ کو آخری شکل دیں، معاہدہ یہ تھا کہ ترکی حکومت کی فوجیں ہندوستان کو فتح کر کے انقلابی حکومت کے حوالے کر دیں گے اور خود واپس چلی جائیں گی اور اس دور میں یا اس کے عوض ترکی حکومت کو برطانیہ کے خلاف رضاکاروں اور مالی امداد کی ضرورت ہوئی تو انقلابی گورنمنٹ ان کی ہر طرح سے امداد

کرے گی اور یہ حملہ فلاں تاریخ کو ہوگا۔ چنانچہ مرکزی غوری نے اس مضمون کا ایک وثیقہ لکھ کر اس پر دستخط بہ مع یقین عہدہا دستخط کنندگان حضرت شیخ الہند رح کے حوالے کیا اور آپ کو خود جاکر صدر جمہوریہ ترکیہ انور پاشا سے بات چیت کرنا اور اس معاہدہ اور وثیقہ کی منظوری لینا تھی۔ چنانچہ آپ اپنی جائداد بطور شرعی قانون وراثت کے تقسیم کر کے بہ ارادۂ حج روانہ ہو گئے۔ اس وقت حجاز وغیرہ میں حکومت ترکی کی تھی اس لئے ارادہ یہ تھا کہ حج کے بہانے میں یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور وہاں پہنچنے کے بعد پھر انور پاشا سے ملاقات کر کے تاریخ اور معاہدہ کی منظوری لے کر واپس اسی راستے سے کابل آجاؤں گا اور پھر وہاں سے آخری کام کیا جائے گا۔ حضرت شیخ الہند رح کا اس لئے بھی جانا ضرور تھا کہ اب تک ترکی اور افغان معاہدہ میں بھی آخری قطعی فیصلہ باقی تھا۔ خیال یہ تھا کہ انور پاشا سے دستخطی معاہدہ لے کر کابل میں لاکر افغان حکومت سے منظور کرا کے بواپسی منظوری کی اطلاع حکومت ترکی کو دی جائے گی۔ خلاصہ کلام یہ کہ آپ کے سامنے یہ تین کام تھے (۱) انقلابی و ترکی حکومتوں کا قطعی معاہدہ (۲) افغانی و ترکی حکومتوں کا یقینی معاہدہ (۳) تاریخ انقلاب کی منظوری۔ ان تین مقاصد کے لئے آپ بہ ارادۂ حج مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ حکومت برطانیہ کا ارادہ تھا۔ آپ کو دہلی میں گرفتار کر لیا جائے۔ لیکن دہلی میں ہجوم اتنا ہو گیا کہ گرفتاری خلاف مصلحت سمجھی گئی۔ پھر بمبئی میں گرفتاری کا ارادہ کیا لیکن چونکہ حکومت کے خفیہ محکمہ سے ڈاکٹر انصاری کے روابط تھے اس لئے آپ نے مل کر گرفتاری کے حکم کا تار جو گورنر جنرل کی جانب سے گورنر بمبئی کو روانہ کیا گیا۔ ہوم سکریٹری کے دفتر میں رکوا کر لیٹ کر دیا جب تار بمبئی پہنچا تو آپ جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔ پھر عدن کے گورنر کو گرفتاری کا حکم اس وقت ملا جب آپ حکومتِ

برطانیہ کے قبضے سے نکل چکے تھے۔ کیا یہ تاخیر بھی کسی خفیہ سازش کا نتیجہ تھی یا قدرت کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ بظاہر دوسری صورت نظر آتی ہے۔ مکہ مکرمہ پہنچ کر آپ نے گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کی۔ غالب پاشا انقلابی تحریک سے پہلے ہی واقف تھے آپ نے اپنا تعارف کرایا اور مقصد ظاہر کیا کہ میں انور پاشا سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں غالب پاشا نے پہلے تو یہ کہا کہ ان معاہدوں کی منظوری میں دے دیتا ہوں آپ لے کر واپس چلے جائیں انور پاشا سے ملنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ انور پاشا کی جنگی میٹی کا میں تحریری ہوں۔ لیکن حضرت شیخ الہند رح کے اصرار پر اس نے گورنر مدینہ کو لکھ دیا کہ یہ ہندوستان کی انقلابی پارٹی کے صدر ہیں، میں نے تحقیقات کرالی ہے اس لئے ان کو انور پاشا سے ملانے کا انتظام کر دیں تاکہ یہ دمشق یا قسطنطنیہ جا کر ان سے ملاقات کرلیں حضرت شیخ الہند رح نے یہاں ایک اور کام کرنا بھی ضروری سمجھا وہ یہ کہ غالب پاشا سے ترغیب جہاد کا ایک مضمون لکھوا لیا تاکہ افغانستان، قبائل اور ہندوستان میں چھپوا کر اس کو شائع کریں گے۔ اس سے بہت زیادہ فائدہ کی امید ہے اس لئے کہ ایک ذمہ دار افسر کی تحریر سے لوگوں کے اذہان میں تحریک کے بارے میں اعتماد پیدا ہوگا۔ ایک دوسرا خط افغان حکومت کے نام لکھوایا، اس دوسرے خط میں ان پرانے معاہدوں کی توثیق تھی اور افغان حکومت کو لکھا تھا کہ محمود الحسن آفندی یعنی شیخ الہند رح تمہارے پاس بہت جلد آ رہے ہیں یہ جو بات کریں ہماری حکومت کی جانب سے اس کی تائید سمجھیں اور اس معاہدہ کو ترک حکومت کا معاہدہ سمجھیں۔ افسوس کہ اس معاہدہ کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی معلوم ہوتا ہے کہ وہی پرانا معاہدہ لوٹایا گیا تھا کہ ہم افغان حکومت کے مقبوضات میں کوئی دخل نہ دیں گے اور اگر ہماری وجہ سے کوئی طاقت افغان حکومت کے خلاف ہوئی

تو ہم اس کے خلاف افغانستان حکومت کی ہر طرح مدد کریں گے۔ در حقیقت یہی معاہدہ پہلے بھی نمائندوں یعنی مہندر پرتاپ وغیرہ کے ذریعے ہوا تھا۔ اور یہی اب غالب پاشا نے لکھ دیا۔ اور یہی بعد میں حضرت شیخ الہند کے ذریعے انور پاشا نے لکھ کر دیا تھا، لیکن انگریز کو غالب پاشا کا یہ عہدنامہ نہیں مل سکا۔ ان کو صرف وہ خط ملا تھا جو عوام کی طرف ترغیب جہاد کے لئے تھا۔ اور اسی کا نام انگریزی سرکاری کاغذات میں غالب نامہ ہے غالب پاشا بعد میں گرفتار ہو گیا تھا، حکومت برطانیہ کا جنگی قیدی رہا ہے، اس وقت بھی اس نے صرف اس دوسرے خط کا اقرار کیا تھا۔ پہلا خط یعنی عہدنامہ والا اس کے متعلق سوال ہی نہیں ہوا۔ غرضیکہ یہ دو خط علیحدہ علیحدہ تھے۔ ہم ایک کا نام وہی غالب نامہ رکھتے ہیں اور دوسرے کا عہدنامہ غالب رکھتے ہیں یا غالب عہدنامہ کہہ لیں۔

غالب نامہ

غالب نامہ لے کر مولانا محمد میاں صاحب انصاری حج کے بعد واپس ہندوستان کو لوٹے۔ مولانا محمد میاں انصاری حضرت نانوتوی رحمؒ کے نواسے تھے۔ اس خط کو لے کر افغانستان گئے[1] اور پھر ہمیشہ وہاں ہی رہے، وہاں بڑے عہدوں پر فائز رہے اور آخر وہاں ہی انتقال فرما گئے۔ آپ بہترین قابلیت کے مالک تھے۔ سیاسیاتِ عالم اور اقتصادیاتِ اقوام پر آپ کو عبور حاصل تھا۔ ملی سیاسیات و شرعی نظامِ حکومت کے متبحر عالم تھے۔ ان موضوعات پر آپ کی متعدد تصنیفات موجود ہیں۔ جن سے ان کی قابلیت و مہارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے آپ افغانستان میں سفارت و وزارت تک کے مناصب میں دخیل وفائز رہے۔ رحمۃ اللہ علیہ کثیراً کثیرا۔ غرضیکہ آپ غالب نامہ لے کر ہندوستان پہنچے۔ یہاں سی آئی ڈی نے اُن کا پیچھا کیا۔ آپ نے اپنا نام بدل کر محمد منصور رکھ دیا اور حلیہ بھی بدل کر یاغستان (آزاد قبائل) میں پہنچ گئے[2]۔

ہندوستان میں غالب نامہ کی اشاعت نہ ہو سکی۔ لیکن آزاد قبائل میں اس کی اشاعت کی۔ رولٹ کمیٹی کو آزاد قبائل سے ہی غالب نامہ کی کچھ کاپیاں سی آئی

---

[1] یہ خط ایک لکڑی کی چھڑی میں بند کر کے لایا گیا تھا۔

ڈی کے ذریعے ملی تھیں۔ پھر وہ غالب نامہ لے کر افغانستان چلے گئے اور وہاں بھی اس کی اشاعت کا کام کیا لیکن اب چونکہ ریشمی خط پکڑا جا چکا تھا اس لئے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

غالب عہدنامہ

باقی رہا غالب عہدنامہ۔ سو ان معاملات کی تفصیل تو ہمیں نہیں مل سکی البتہ سی۔ آئی۔ ڈی کے کاغذات سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ عہدنامہ افغان حکومت کو بعد از وقت ملا۔ جب کہ ریشمی خط کا راز فاش ہو چکا تھا۔ اس لئے کہ آپ افغانستان بہت دیر سے پہنچے۔ البتہ اس عہدنامے نے افغانستان کے انقلاب پسند عنصر کی ہمتوں کو مضبوط کیا۔ اور امان اللہ خاں جو اس پارٹی کے سرخیل سمجھے جاتے تھے انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے حبیب اللہ خاں کو قتل کروادیا اور خود حکومت پر قابض ہو گئے۔ اور افغانستان کو انگریزی تسلط سے جنگ لڑ کر آزاد کرا لیا۔ درحقیقت غالب عہدنامہ میں کچھ ایسی تدبیریں بھی درج تھیں جن سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور کامیاب ہوئے۔ واللہ اعلم کیا کچھ تدبیریں تھیں۔

انور نامہ

اس کے بعد شیخ الہند مدینہ منورہ تشریف لے گئے، وہاں گورنر مدینہ سے ملاقات کی اور اس نے آپ کو شام بھیجنے کے انتظامات کر دینے کا وعدہ کیا۔

ابھی کچھ دن ہی گزرے تھے کہ گورنر نے کہا کہ انور پاشا اور جمال پاشا زیارتِ نبوی ؐ کے ارادے سے یہاں آرہے ہیں، اُن سے یہیں آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔ چنانچہ تاریخ مقررہ پر یہ دونوں حضرات مدینہ منورہ تشریف لائے۔ عمومی ملاقات کے علاوہ حضرت شیخ الہند نے خصوصی ملاقات فرمائی اور دوسرے روز واپس چلے گئے۔ اور دونوں معاہدوں کے کاغذات ساتھ لے گئے۔ کہ وہاں سے دستخط کر کے بھیجیں گے۔ چنانچہ ایک ماہ بعد گورنر مدینہ نے حضرت شیخ الہند کو بلا بھیجا۔ دونوں معاہدے مع دستخطوں کے آپ کو دئیے۔ ایک معاہدہ تو ترکی حکومت اور ہندوستان کی حکومتِ وقت کے درمیان تھا جو حکومتِ موقتہ انقلابی پارٹی نے قائم کی تھی۔ ہم اس کو انقلابی ترکی معاہدہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور دوسرا معاہدہ افغان حکومت اور ترکی حکومت کے درمیان تھا۔ تاریخ انقلاب کا تعین بھی اسی میں تھا یعنی ۱۹۔ فروری ۱۹۱۷ء ہم اس کو افغان ترکی معاہدہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ غرضیکہ یہ دو عہدنامے دو خطوں میں علیحدہ علیحدہ تھے۔ اس مجموعے کا نام اتو رنامہ ہے۔ اور ایک کا نام ترکی انقلابی معاہدہ اور دوسرے کا نام افغان ترکی معاہدہ۔

(۱)؛ ترکی انقلابی معاہدہ کا تعلق خود حضرت شیخ الہند اور ہندوستان و انقلابی پارٹی سے تھا، اس لئے حضرت شیخ الہند نے وہ تو اپنے پاس رکھا جو غالباً گرفتاری کے وقت بیکار سمجھ کر اور نیز اس وجہ کہ اس سے حکومتِ برطانیہ کئی ایک رازوں سے مطلع ہو گی ضائع کر دیا، یا ممکن ہے کسی کے پاس حجاز ہی میں رکھا ہو۔ اور اس نے پھر اس کو بیکار سمجھ کر ضائع کر دیا۔ یا ممکن ہے کہ حضرت

کی رہائی کے بعد یہاں ہندوستان میں حضرت کو پہنچا دیا ہو۔ یہ سب احتمالات ہیں اور حضرت نے خود کبھی ہمیں اس کے متعلق نہیں بتایا کہ کیا ہوا اور نہ ہی ہم نے کبھی پوچھنے کی جرأت کی۔ یہ یوں ایک معمّا بن گیا، مؤرخین کے لئے باعث نزاع اور اشکال بن گیا۔ خدا جانے کہ کیا معاملہ ہے۔ واللہ اعلم!

۲: افغان ترکی معاہدہ حضرت شیخ الہند نے مولانا ہادی حسن خاں جہان پوری کو دیگر ہندوستان روانہ کر دیا کہ یہ اس طرح فلاں فلاں حضرات کے ذریعے سے افغانستان پہنچایا جائے۔ اس میں ترکی حکومت نے اپنی جانب سے معاہدہ کو آخری شکل دے دی تھی۔ اور اب صرف افغان حکومت کی منظوری کی اطلاع واپس حضرت شیخ الہند کے ذریعے ترکی حکومت کو پہنچنی تھی۔ اس کے بعد ترکی حکومت کو حملہ کر دینا تھا۔ البتہ حضرت شیخ الہند نے افغانستان اور ہندوستان کے قائدین تحریک کو یہ ہدایات دے دی تھیں کہ کام میں کہیں تیزی و پیش قدمی نہ ہو جائے۔ جو باعث نقصان اور خون خرابہ ہو اس لئے تمہیں اپنی ماتحت سب برانچوں کو بھی یہ ہدایات دینی ہیں کہ جب افغان حکومت کی منظوری کی اطلاع ترکی حکومت کو پہنچ جائے اور میں اس کی اطلاع کابل اور دہلی کے مرکزوں کو دوں اور پھر یہ مرکز آگے اپنی اپنی برانچوں کو مطلع کریں کہ کام پورا ہو گیا ہے اس لئے تم تاریخ مذکورہ پر قدم اٹھاؤ اور بغاوت و حملہ شروع کر دو تو تب اقدام کرنا۔ ورنہ جب تک میری اطلاع تمہارے مرکزوں کو نہ ملے اور نہ برانچوں کو تمہاری اطلاع ملے تو سمجھو کہ کوئی حادثہ پیش آچکا ہے پھر کوئی قدم نہ اٹھانا۔ اور انتظار کرنا۔

خلاصہ یہ کہ افغان حکومت کی منظوری کا جواب شیخ الہند کے ذریعے سے ترکی حکومت کو پہنچا تھا اور پھر حضرت شیخ نے آخری اقدام کا حکم دینا تھا۔ اور اس کے مطابق عمل ہونا تھا اس لئے کہ اس ساری تحریک کا مرکزی نقطہ حضرت شیخ کی ذاتِ اقدس تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ریشمی خط پکڑا جاتا ہے تو اگر کسی برانچ کو اس کی اطلاع نہیں ہوتی اور انگریزی دسترس سے بھی وہ بچ جاتی ہے تب بھی تاریخ مذکور پر وہ کوئی اقدام نہیں کرتی۔ اس لئے کہ ہر شخص آخری اقدام کے حکم کا منتظر تھا۔ جب یہ حکم نہ ملا تو ہر شخص سمجھ گیا کہ ضرور کوئی حادثہ پیش آگیا ہے اسی لئے آخری اقدام کا حکم نہیں ملا۔ حضرت شیخ کی حسنِ تدبیر ملاحظہ فرمائیے۔

غرضیکہ یہ خط لے کر مولانا ہادی حسن صاحب ہندوستان پہنچتے ہیں۔ یہ خط صندوق کے تختے کے درمیان بند کیا گیا تھا۔ اس طرح کہ باہر سے دیکھنے والے کو محسوس نہ ہو کہ دو تختیاں ملا کر ایک بنائی گئی ہے۔ یہ صندوق حضرت شیخ نے ایک کاریگر سے ساگوان کی لکڑی کا تیار کرایا تھا۔ ایک جانب کے تختے کو دو پتلی تختیوں سے اس طرح ملایا گیا تھا کہ ایک ہی تختہ معلوم ہو اور پھر اس میں کچھ کپڑے رکھ کر مولانا ہادی حسن کو دیا گیا تھا۔

مولانا ہادی حسن صاحب بمبئی پہنچتے ہیں۔ حضرت شیخ نے پہلے سے بمبئی کے ایک کارکن کو اطلاع کسی ذریعے سے بھیج دی تھی کہ مولوی ہادی حسن اس طرح آرہے ہیں اور ان کی جہاز سے اترتے ہی سخت تلاشی ہوگی لہٰذا جہاز سے وہ امانت لے کر جہاں وہ کہیں پہنچا دینی ہوگی۔ ادھر مولانا ہادی حسن

کو بھی یہ ساری ترکیب بتادی تھی کہ تم صندوق ان کے حوالے کر کے آگے پہنچانے کا مقام بتادینا اور تاکید کر دینا کہ وہ یہ صندوق اپنے پاس نہ رکھیں ورنہ پولیس کو اطلاع مل جائے گی اور یہ شبہ ضرور ہوگا کہ یہ شخص جہاز پر کیوں گیا تھا اور کس سے ملا تھا۔ یہ باتیں بے حد خطرناک ہیں اور سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔

مولانا ہادی حسن کو اس کی پوری شناخت کرادی گئی۔ چنانچہ جہاز پر ہی یہ صاحب مولانا ہادی حسن صاحب سے ملتے ہیں اور آپ ان کو یہ تاکید کرتے ہیں کہ ابھی یہ صندوق مظفر نگر میں محمد نبی صاحب کے پتے پر پارسل کر دیں۔ یہ نام حضرت شیخ الہند نے تجویز فرمایا تھا اور کسی دوسرے ذریعے سے محمد نبی صاحب کو بھی اطلاع کر دی تھی کہ صندوق میں فلاں جگہ کاغذات ہیں نکال کر فلاں مقام پر پہنچا دینا۔ چنانچہ وہ بمبئی والے صاحب حسب ہدایت جہاز پر سے صندوق اپنے قبضے میں لے کر عام مسافروں میں مل کر قلیوں سے اٹھوا کر صندوق باہر لے آتے ہیں کسی کو ان پر شبہ ہی نہیں ہوتا۔ اور باہر آ کر سیدھے اس کو مظفر نگر چلتا کر دیتے ہیں۔ اُدھر سی۔ آئی۔ ڈی کو اطلاع ملی تھی کہ حضرت شیخ الہند خود اس جہاز سے تشریف لا رہے ہیں۔ درحقیقت حضرت شیخ الہند اس قافلے کو روانہ کرنے جدّہ تشریف لا رہے ہیں، وہاں جدّہ میں دیکھ کر انگریزی جاسوسوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ اس جہاز سے جا رہے ہیں اور یہی غلط رپورٹ بمبئی سی۔ آئی۔ ڈی کو کر دی۔ چنانچہ جہاز پر سی۔ آئی۔ ڈی والے حضرت شیخ کو تلاش کرتے رہے جب

یقین ہو گیا کہ وہ نہیں آئے تو ان کے ساتھیوں کو حراست میں لے لیا۔
جن میں مولانا ہادی حسن صاحب بھی تھے۔ اور سخت تلاشی لی مگر کوئی مشتبہ
چیز برآمد نہ ہوتی تھی نہ ہوئی۔ اس کے بعد مولانا ہادی حسن صاحب کو
نینی تال لے جا کر قید کر دیا۔ پوچھ گچھ ہوئی لیکن آپ مضبوط قدم رہے
اُدھر حاجی محمد نبی صاحب کو حضرت شیخ کی ہدایات مل چکی تھیں ان پر عمل
کیا۔ یہ خط نکال کر حاجی نور الحسن صاحب کو دیا۔ انھوں نے حاجی مرزا احمد
صاحب سے فوٹو اتروا کر اُن کو خصوصی مقامات یعنی مراکز تحریک میں
پہنچا دیا۔ لیکن اس کے بعد وہ مراکز ان سے چنداں فائدہ نہیں اٹھا
سکے۔ اور اسی اثنا میں ریشمی خط پکڑا گیا۔ اور یہ جلا دیئے گئے۔ ان
تینوں حضرات کے ہاں پولیس کے چھاپے پڑے مگر ناکام رہے۔ حاجی
محمد نبی کے ہاں جب چھاپا مارا گیا تو انھوں نے یہ خط ایک واسکٹ کی
جیب میں ڈال کر اس کو صحن میں ایک کھونٹی پر لٹکا دیا اور کسی کو شبہ بھی
نہ گزرا۔ حاجی نور الحسن صاحب کے ہاں اسی روز چھاپا مارا گیا مگر خط تو
ابھی وہاں پہنچا ہی نہ تھا بعد میں وہاں پہنچا۔ احمد مرزا فوٹو گرافر کے مکان
پر دو دفعہ چھاپا مارا گیا۔ پہلی دفعہ تو خط پہنچا ہی نہ تھا اور دوسری دفعہ ایک
کرسی کے نیچے ایک تھالی میں پڑا رہا۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ انور پاشا کے خط
دو تھے۔ ایک خط میں قوم سے اپیل کی گئی تھی کہ حضرت شیخ الہند کا
ساتھ دیں۔ درحقیقت یہی خط فوٹو اتروا کر تحریک کے مرکزوں میں پہنچا دیا
جاتا ہے۔ دوسرا خط افغان حکومت کے نام تھا جس میں معاہدہ کا ذکر تھا

وہ خط حاجی نبی محمد صاحب کے پاس محفوظ رہا۔ مولانا ہادی حسن صاحب نے رہائی کے بعد اس کو خود افغانستان پہنچایا اور وہاں پہنچا کر خود ہندوستان تشریف لے آئے۔ آپ نے قریباً دو ماہ میں یہ دشوار گزار سفر طے کیا۔ یہ غلط ہے کہ افغانستان سے ایک خوشی محمد نامی نوجوان یہاں ہندوستان آیا اور مولانا ہادی حسن صاحب سے خط لے گیا۔ بلکہ مولانا ہادی حسن صاحب فوراً اپنا حلیہ بدل کر اور اپنا نام ظفر احمد رکھ کر تشریف لے گئے تھے۔ غرضیکہ انور نامہ کا ایک حصہ حضرت کے پاس رہ گیا۔ جو صرف اُردو زبان میں تھا۔ اور دوسرا تحریک کے مرکزوں میں پہنچایا گیا جو ترکی، عربی، فارسی میں تھا اور جو وہاں کے لیڈروں نے حکومت افغانستان کو دے کر اس کا جواب لے کر واپس شیخ الہند کو مدینہ منورہ پہنچا دیا۔ اب ہماری بحث صرف اسی تیسرے حصے سے متعلق ہے۔ کابل میں یہ خط پہنچا تو وہاں کے لیڈروں نے حکومت کو دے کر جواب کا مطالبہ کیا۔ امیر حبیب اللہ اپنی کمزوری کے باعث سے انگریز سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اور اب کسی طرح جان بچا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے مشورہ کے لئے فوجی افسروں، سول عہدہ داروں اور قبائل کے سرداروں کو جمع کیا۔ اور اس جرگے کے سامنے یہ رائے رکھی، اس میں مولانا صاحب بھی انقلابیوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ حبیب اللہ خاں کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ سارا جرگہ مع اس کے دو بیٹوں امان اللہ اور نصر اللہ کے جنگ کے لئے آمادہ بلکہ مشتعل ہے۔ یہ دراصل ہندوستانی لیڈروں کی جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ آخر حبیب اللہ خاں

نے اپنے شاہی اختیارات کا سہارا لے کر ایک درمیانی راہ نکالی کہ ترکی فوجیں بعض سرحدی علاقوں سے گزر کر جائیں اور ہم انگریز کے سامنے مجبوری کا اظہار کر دیں گے کہ یہ قبائل باغی ہو کر ہمارے قبضے سے باہر ہو چکے ہیں۔ اندرون ملک کا کوئی آدمی اپنے طور پر جہاد میں حصہ لینا چاہے تو آزاد ہے لیکن حکومت بحیثیت حکومت غیر جانب دار رہے گی۔ انقلابی لیڈروں نے اسی کو غنیمت سمجھا اور افغان حکومت سے اس کا معاہدہ لے لیا جو کہ نائب السلطنت نصر اللہ خاں نے لکھ کر اپنی نگرانی میں محفوظ کرنے کا انتظام حضرت مولانا سندھی کی رائے کے بموجب کیا۔ حضرت سندھی نے یہ انتظام کیا کہ اس معاہدہ کی ساری عبارت مع تاریخ حملہ یعنی ۱۹۔ فروری ۱۹۱۷ء کے ایک کپڑے پر بنوائی۔ اور یہی ریشمی رومال ہے جس کی تفصیل ہم یہاں درج کر رہے ہیں اور جس کے نام پر اس ساری تحریک کا نام رکھا گیا۔ اور جس کے نام سے یہ کتاب موسوم ہوئی۔ اور جس کی حقیقت سمجھانے کے لئے یہ اوراق لکھے گئے۔ ہم اس کی حقیقت اور واقعہ درج ذیل کرتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اصل واقعہ کوئی طول طویل داستان اور لمبا چوڑا قصہ نہیں ہے، ایک مختصر سی بات ہے۔ جو اپنی نزاکت و لطافت میں نرالی شان رکھتی ہے۔ اور جس کا پس منظر بڑا ہی مہیب ہے جس کی تفصیل ہم بیان کر چکے ہیں۔

ریشمی رومال

حضرت سندھی اور نصر اللہ خاں نے مل کر ایک ماہر کاریگر سے ایک ریشمی رومال اس طرح بنوایا کہ اس کی بناوٹ میں معاہدہ کی پوری عبارت اور تاریخ حملہ کی منظوری کی عبارت بھی بُن دی گئی۔ یہ عبارت عربی زبان میں تھی اور دستخط حبیب اللہ اور اس کے تینوں بیٹوں یعنی امان اللہ، نصر اللہ اور عنایت اللہ خاں کے ایک دفعہ تو بُننے میں آگئے تھے۔ پھر اس رومال کے اوپر ان چاروں کے دستخط زرد رنگ کی سیاہی سے کروائے گئے۔ یہ رومال بھی زرد رنگ کا تھا جس کی لمبائی ایک گز تھی اور عرض بھی اتنا ہی تھا۔ ایک رکن تحریک جو پیغام رسانی کا کام کیا کرتے تھے اور افغانستان و ہندوستان میں کپڑے کا کاروبار کرتے تھے ہندوستان کا کپڑا افغانستان لے جاتے اور پھر افغانستان کا ہندوستان اس طرح ان کا کاروبار بھی اچھا چل رہا تھا اور ساتھ ہی تحریک کی پیغام رسانی کا کام بھی اچھی طرح انجام دیتے تھے۔ حضرت مولانا شیخ الہند سے بیعت تھے اور آپ کی اس تحریک کے معتمد علیہ رکن بھی تھے۔ یہ نو مسلم نوجوان تھے انگریزی ایم اے تھے معاملہ فہم اور زیرک شخص تھے۔ ان کا اسلامی نام شیخ عبدالحق تھا۔ یہ بنارس کے ایک ہندو لڑکے تھے۔

یہ بہت بڑے رئیس خاندان سے تھے، اسلام کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا غرضیکہ ریشمی رومال ان کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ حسب ہدایت اسے لے کر پشاور پہنچے۔ رومال ان کے تجارتی پارچات میں تہہ کیا ہوا تھا۔ انھوں نے اسی قسم کے رومال پانچ درجن خرید لئے تھے۔ اور انہی میں یہ بھی رکھوا لیا تھا اس لئے سرحد پر کسی کو پتہ نہیں ہو سکا۔ ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ اگر ہو سکے تو خود حیدر آباد سندھ میں شیخ عبدالرحیم صاحب کو دے دیں۔ اور شیخ عبدالرحیم کو مولانا ہادی حسن صاحب پہلے پروگرام دے چکے تھے۔ کہ یہ رومال لے کر حج کو جائیں اور وہاں شیخ الہند کے حوالے کر دیں اور اگر شیخ عبدالحق کو کوئی خطرہ لاحق ہو جائے تو یہ رومال پشاور میں تحریک کے رکن خان بہادر حق نواز صاحب کو دے دیں اور ان کو یہ سب ہدایات سمجھا دیں۔ چنانچہ شیخ عبدالحق صاحب کا پہلے تو یہی ارادہ تھا کہ خود حیدر آباد سندھ جائیں گے اور یہ امانت منزل مقصود تک پہنچا دیں گے۔ مگر پشاور اور سرحد پر اس دفعہ اتنی پوچھ گچھ اور تلاشی ہوئی کہ آپ کو خطرہ محسوس ہوا اور آپ نے ارادہ بدل دیا۔ اور ریشمی رومال حق نواز خاں کے حوالے کر کے ہدایات دے دیں۔ حق نواز خاں کو یہ امانت رات کو نو بجے ملتی ہے آپ اسے سحری کے چار بجے روانہ کر دیتے ہیں۔ اور آپ کے اعتمادی آدمی نے یہ ریاست بہاولپور میں دین پور سجادہ نشین خواجہ غلام محمد کو دینی تھیں۔ وہ پیغامبر بخیر و عافیت اس کو دین پور خواجہ صاحب کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ ادھر پشاور میں صبح کی نماز سے پہلے ہی حق نواز کے مکان پر فوج کا چھاپہ پڑتا ہے لیکن وہ چیز تو اب نکل چکی تھی۔ خان صاحب کو گرفتار کر لیا

اور زبردست پوچھ گچھ ہوئی۔ لیکن آپ مضبوط رہے۔ اور جو کچھ پوچھتے رہے آپ انکار کرتے رہے۔ ایک ماہ بعد آپ کو رہا کر دیا گیا۔ ادھر دین پور میں امانت پشاور سے صبح چل کر دوسرے دن صبح تقریباً دس بجے پہنچی ہے۔ جنگ کا زمانہ تھا اس لئے آپ نے بھی ایک معتمد آدمی کے ہاتھ بارہ بجے سندھ روانہ کر دی۔ یہ امانت تو خواجہ صاحب نے سندھ روانہ کر دی مگر شام کے چار بجے فوج پہنچ گئی۔ مکان کا محاصرہ کر کے تلاشی دس بجے رات تک لیتی رہی مگر کچھ برآمد نہ ہوا۔ مگر خواجہ صاحب کو پہلے بہاولپور پھر فیروزپور لے جا کر پوچھ گچھ کی۔ آپ نے کچھ نہ بتایا تو قید کر دیا۔ چار ماہ بعد رہا ہوئے۔ ادھر یہ امانت دوسرے دن ظہر کو شیخ عبدالرحیم صاحب کو ملتی ہے۔ وہ عشا کو اس ریشمی رومال کو اپنے ایک کپڑے میں رکھ رہے تھے کہ حلیہ بدل کر ابھی گھر سے روپوش ہو جاتا ہوں۔ انھوں نے حلیہ بدل لیا تھا۔ اب صرف اس رومال کو اپنے ایک فقیرانہ رومال میں چھپانا چاہتے تھے۔ انھوں نے رومال نکالا ہوا تھا۔ ہاتھ میں سوئی تاگا لئے اس کو گودڑی میں سی رہے تھے کہ اچانک فوج دیواریں پھاند کر اندر آگئی۔ انھوں نے اس ریشمی رومال پر قبضہ کر کے اپنے ہاتھ میں لے لیا، اتنے میں یہ بھی دیواریں پھاند کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اور ایسے فرار ہوئے کہ آج تک پتہ نہیں۔ آپ مسٹر کرپلانی کے حقیقی بھائی تھے۔ مولانا سندھی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اسلامی نام شیخ عبدالرحیم رکھا۔ غالباً آپ اس لئے روپوش ہوئے کہ کہیں حکومت کے تشدد سے گھبرا کر میں تحریک کے راز نہ بتا دوں جس سے کہ میرے بزرگوں کو تکلیف ہو۔ کہتے ہیں کہ آپ روپوشی کی حالت میں روس

چلے گئے ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہاں ہندوستان میں ہی مفیری حالت میں رہے اور آخر سرہند میں انتقال کر گئے ۔ واللہ اعلم ! لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ اپنے بزرگوں کی بھلائی کے لئے اپنی زندگی ختم کر دی ۔ اس کا نام ہے صحیح محبّت اور عقیدت ۔

غرضیکہ ریشمی رومال حکومت کو مل گیا اور اس کے ذریعے سے رازہائے سربستہ معلوم کر لئے گئے ۔ اس سے پہلے بھی تحریک کی پوری رپورٹ سی آئی ڈی حکومت کو دیتی رہی تھی مگر ان کے پاس کوئی تحریری ثبوت نہیں تھا ۔ اب جب کہ حکومت کو تحریری ثبوت مل گیا تو سی آئی ڈی کی پچھلی سب رپورٹوں پر یقین ہو گیا اب رہی یہ بات کہ ریشمی رومال کی رپورٹ حکومت کو کس نے پہنچائی مولانا سندھی کو کسی نے غلط بتایا ہے کہ حق نواز نے یہ خبر حکومت کو دی یا یہ کہ ریشمی رومال دیا ۔ اس لئے کہ ریشمی رومال یقیناً سندھ سے حکومت کو ملا ہے ۔ اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ حق نواز نے ڈر کر حکومت کو یہ معاملہ بتا دیا تھا ۔ یہ محض قیاسات ہیں ورنہ حق نواز خاں صاحب بڑے مضبوط آدمی تھے ۔ پھر یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ اگر حق نواز نے دین پور سندھ کا پتا بتا دیا تھا تو پہلے حق نواز خاں کی خبر کس نے دی کہ رات کو انھیں خط ملتا ہے اور صبح سویرے ہی ان پر چھاپہ پڑتا ہے ۔ سوچنے کی بات ہے ۔ مزید بر آں شیخ عبدالحق صاحب کی سرحد اور پشاور شہر میں کیوں تلاشی لی جاتی ہے اور پوچھ گچھ کی جاتی ہے ؟ یہ باتیں کس نے بتائیں حقیقت یہ ہے کہ سب خبریں اور ان مقامات کے پتے اور ریشمی رومال کی پوری تفصیل امیر حبیب اللہ خاں اور اس کے لڑکے

عنایت اللہ خاں نے حکومت برطانیہ کو بتادی تھیں۔ اور بذریعہ لاسلکی یہ سب خبریں ہندوستان پہنچائی جاچکی تھیں۔ امیر حبیب اللہ خاں کے یہی کارنامے تھے جو اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئے۔ اور عنایت اللہ خاں کے بھی ولی عہدی کے سب خواب پریشاں ہو گئے۔

ریشمی رومال کے بعد

جب سی آئی ڈی کی سب اطلاعات کی تصدیق ہو گئی اور ریشمی رومال کی عبارت سے حکومتِ برطانیہ کو انقلابیوں کے ارادوں اور ترکی حکومت کی پالیسیوں کی قطعی تصدیق ہو گئی تو اس نے مناسب اقدامات کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ افغان حکومت یعنی حبیب اللہ خاں تو جاسوسی کر کے انگریز کی زد سے بچ گیا صرف اتنا ہوا کہ انگریز کے کہنے پر کابل میں سب انقلابیوں اور ان کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا حتیٰ کہ حبیب اللہ خاں قتل ہوتا ہے اور امان اللہ خاں تختِ حکومت پر قابض ہوتا ہے تو پھر یہ لوگ رہا ہوتے ہیں۔ ادھر ہندوستان میں بھی حکومت نے پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور ہر مشتبہ آدمی کو گرفتار کر لیا۔ اور بہت سے لوگوں کو نظر بند کر دیا۔ اور ہر اس مقام پر فوج بھیج دی جہاں بغاوت اور گڑبڑ کا خطرہ تھا۔ مزید برآں شمال مغربی سرحد پر بہت زیادہ فوج بھیج دی اور دوسرے حفاظتی انتظامات بھی اختیار کیے گئے۔ ادھر ترکی کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کر دیا اور ترکی کی ہر سرحد پر جنگ شروع ہو گئی۔ ایران میں فوجیں داخل کر کے افغانستان اور ترکی کے درمیانی رابطے کو ختم کر دیا۔ سب سے آخر یہ کہ ترکی کے خلاف عرب قوم کو بغاوت پر

آمادہ کیا اور اس کام کے لئے شریف مکہ کو آلۂ کار بنایا اور اس نے غداری کر کے ترکی حکومت سے بغاوت کر دی۔ اور عربوں کو عرب قومیت کے فریب کن نعرے سے متاثر کر کے ترکی غریب کو پورے مشرق وسطیٰ سے نکال دیا۔ اور عربوں نے ترکوں پر وہ مظالم کئے کہ خدا کی پناہ، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستانی اور عربی علماء سے ترکی کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرائے۔ اور دنیا میں یہ پروپیگنڈا کرایا کہ نعوذ باللہ ترک مسلمان نہیں رہے ان کی خلافت ختم ہو گئی ہے اور ان کے خلاف جہاد کرنا فرض ہے چنانچہ ہندوستان و عرب کے شریفی علماء نے دل کھول کر کفر کے فتوے دیئے پھر انہی فتووں کو اپنے مخالف علماء کے کچلنے کے لئے بہانہ بنایا کہ جو عالم ترکی کے خلاف کفر کا فتویٰ نہ دے اس کو قید یا نظر بند کر دیا جاتا۔ اور ان کو مختلف طریقوں سے تنگ کیا جاتا۔ چنانچہ شیخ الہند کی گرفتاری کا بہانہ پہلے ہی بنایا گیا تھا، گو بعد میں مصر کی عدالتی کارروائی سے پتہ چل گیا کہ یہ گرفتاری درحقیقت اس تحریک انقلاب کا نتیجہ ہے۔ فتویٰ تو ویسے بہانہ تھا ان کی گرفتاری کے لئے اس لئے کہ حکومت برطانیہ تحریک کے رازوں سے لوگوں کو مطلع نہیں ہونے دیتی تھی۔ مبادا کوئی اشتعال نہ پیدا ہو جائے۔ بدیں وجہ فتوے کا بہانہ بنا کر شریف کو گرفتاری کا حکم دیا۔ خلاصہ یہ کہ حکومت برطانیہ نے جو جو انتظامات کئے وہ یہ تھے:

۱۔ افغانستان میں تحریک کے لیڈروں کی گرفتاری۔ ۲۔ ہندوستان میں تحریک والوں کی گرفتاری و نظر بندی۔ ۳۔ سرحد پر اور دوسرے مقامات پر

فوج کا اجتماع ۔ ۵ ایران میں فوجوں کا بھیجنا ۔ ۶ ۔ ترکی پر حملہ ۔ ۷ ۔ ترکی کے خلاف فوجوں کی بغاوت ۸ ۔ ترکی کے کفر کا فتویٰ ۔ یہ مجموعی آٹھ انتظامات ہیں ۔

باقی رہے تحریک والے سو ان میں بہت سے تو گرفتار ہو گئے جو باقی بچے ان میں زیادہ وہی تھے جو اندرون ملک رہتے تھے ۔ اور وہ از خود کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے ۔ لہٰذا مجبوراً خاموشی اختیار کرنی پڑی اور خاموش رہے ، اور جو سرحدوں پر رہتے تھے اور کچھ کر سکتے تھے ۔ انھوں نے کام کیا چنانچہ اوگی کے مقام پر بھی قبائلیوں نے حملہ کیا ۔ اور تین سال تک متواتر لڑتے رہے ۔ اسی طرح حاجی صاحب ترنگ زئی شریف والے بھی لڑے اور قبائل کو اکٹھا کر کے تین سال مقابلہ کرتے رہے ۔ اسی طرح قلات اور لس بیلا کے قبائل نے بھی لڑائی لڑی اور پورے دو سال لڑتے رہے ۔ بس ان تین مقامات پر تو چونکہ لڑ سکتے تھے اس لئے لڑے اور مقابلہ کیا ۔ باقی ہندوستان کے لوگ کچھ نہ کر سکتے تھے ۔ اور نہ ہی کچھ کیا ۔ اس لئے کہ وہ مجبور تھے ۔ البتہ افغانستان والوں نے اندر رہ کر بھی خوب کام کیا ۔ انھوں نے اندر سے تحریک چلائی اور آزاد خیال لوگوں کو امان اللہ کے ساتھ ملنے کا حکم دیا وہ مل گئے ۔ اور حبیب اللہ خاں کو قتل کر کے امان اللہ خاں کو حکومت پر قابض کرایا ۔ اور رہا ہونے پر اس نے ہندوستان پر حملہ کر دیا ۔ اس وقت جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی ۔ اس لئے انگریز کی پوری قوت یہاں جمع ہو گئی ۔ اندریں صورت اب ہندوستان کا فتح کرنا تو ناممکن تھا اس لئے کوہاٹ تک

قبضہ کرنے کے بعد انگریز نے ان کی آزادی اور استقلال تسلیم کر لیا اور انھوں نے ان کا یہ مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا اور پہلی مقررہ سرحدوں پر راضی نامہ ہو گیا گویا جنگ کے نتیجے میں افغانستان کو صرف آزادی ملی ۔ یہ بھی غنیمت تھی اس لئے اسی پر اکتفا کیا گیا ۔ حضرت شیخ الہند کو مکہ مکرمہ میں گرفتار کر کے مصر میں فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا ۔ کوئی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے مالٹا میں جنگی قیدی کر کے بھیج دیا ۔ اختتام جنگ تک وہاں ہی رہے ۔ جنگ ختم ہونے پر آپ کو رہا کر دیا گیا ۔ اور آپ واپس ہندوستان تشریف لے آئے ۔ خلافت تحریک میں کچھ عرصہ کام کر کے انتقال فرمایا ۔ خلاصہ یہ کہ تحریک والے انقلابی بھی کچھ گرفتار ہوئے ، کچھ گھروں میں مجبوراً خاموش بیٹھے رہے کچھ افغانستان ہوئے پھر رہا بھی ہوئے اور بعض ایسے بھی تھے جو دوسرے ملکوں میں تھے وہ وہاں ہی رہے ۔ شمال مغربی سرحدوں پر رہنے والوں نے مقابلہ کیا ۔ بعض ملک سے باہر ہی گرفتار ہوئے اور گرفتار رہے جیسے حضرت شیخ ۔ بعضوں نے ایسی کمزوری دکھائی کہ انگریز کو سارے واقعات بتائے ۔ یہ لوگ بھی گویا سات حصوں میں منقسم ہو گئے ۔ اب یہاں یہ بحث ختم کی جاتی ہے

وما علینا الا البلاغ !

(۴) اب حضرت عبید اللہ سندھی کی ذاتی ڈائری سے چند اقتباسات ان کے اپنے لفظوں میں بجنسہ نقل کئے جاتے ہیں ۔ حالات کی پیچیدگی اور واقعات کی سربستگی ۔ افغانستان میں حکومت وقت کے جو جو حالات و واقعات طریق کردار و قوانین حکومت کے کوائف اس مخصوص کتاب میں تھے ۔

ا: ان کا عام پروپیگنڈا آسان نہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے گہرے واقعات کیسے معلوم ہوئے۔ ہمارا خیال ہے کہ راجہ صاحب کی عزت محفوظ کرنے کے لئے لالہ لاجپت رائے ہم سے ملے۔ اس کے بعد ہر ایک بات ہمارے نام سے کہی جاتی ہے۔ ہماری ملاقات سے لالہ جی نے اور بھی فائدہ حاصل کرنا چاہا جس میں افسوس کہ انھیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ یہاں پر یہ ایک جملہ معترضہ ہے:

(۲) ہندوستانی مشن کی ناکامی اور معلوماتی کم مائیگی

مفصل ملاقاتوں سے ہمیں معلوم ہوا کہ مشن کے ہندوستانی ممبر اور جرمن ممبر یک جہتی قائم نہ رکھ سکے جو ایسی سیاسی مہمات کے لئے ضروری ہے۔ ہندوستانی ممبر سارا الزام جرمن ممبروں پر تھوپتے تھے لیکن جرمن ممبر شکایت کرتے تھے کہ جو سبز باغ برلن اور استنبول میں دکھائے گئے ان کا عشر عشیر بھی یہاں نظر نہیں آتا۔ اس مشن کا جو مقصد بیان کیا جاتا ہے انصاف یہ ہے کہ مشن نے اس کے مطابق کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ راجہ صاحب کو جب میں نے بعض کوتاہیوں پر متنبہ کیا تو فرمایا کہ جرمن چانسلر نے بھی مجھے اس طرف توجہ دلائی تھی اور میرے لئے آسانی پیدا کرنی چاہی تھی مگر میں نے خلاف شان سمجھ کر انکار کر دیا

(۳) مسلمانوں کا احساسِ کہتری اور ہندوؤں کی ذہنی عصبیت

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں فقط اس قدر تھا کہ جرمنی اور ترکی اتحاد میں اگر

افغانستان شمولیت کا مقصد کرے تو مالوی جی کا ایک نمائندہ اس سے واقف ہوتا رہے۔ اور جہاں تک ممکن ہو ہندوستان کی سرحد سے اس مصیبت کو ٹالتا رہے معاملات میں جو پوزیشن شاہ افغانستان کو حاصل ہو اس میں راجہ نیپال کو شریک کرنے کی کوشش کرے۔ انڈین سوسائٹی برلن نے پوری دانش مندی سے اس ہندو تحریک کو ہندوستانی کا رنگ دینے کے لئے مولانا برکت اللہ صاحب کو بھی برائے نام اس میں شریک کیا۔ مولانا مرحوم کی شمولیت کو جس قدر ہم بے معنی دکھلا رہے ہیں اس کا مولانا سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کی اس غفلت کی سزا ہے جو اپنے آپ کو اقلیت میں فرض کر کے اکثریت کے رحم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب ایک شخص کے ذہن میں یہ ٹھونس دیا جائے کہ تم اس بت کدہ کی اجازت نہ ہونے کی صورت میں کام نہیں کر سکتے تو اس شخص کے بیکار ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ میں اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے ایک دو مثالیں لکھتا ہوں۔ مولانا محمد علی اور مولانا ابو الکلام جب اپنا اجتہاد مہاتما گاندھی کے سپرد کرتے ہیں تو کیا وہ اپنی قربانیوں سے مستفید ہو سکتے ہیں یا ڈاکٹر انصاری کو اگر سوامی شردھانند سے وابستہ کر دیا جائے تو اس کی محنت کوئی نتیجہ دے سکتی ہے اسی طرح اگر مولانا برکت اللہ راجہ صاحب سے اختلاف کر کے اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے تو ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے

(ذاتی ڈائری از صـ۸۷ تا صـ۹۴)

(۴) نوجوان طاقت کی تنظیم

جب ہم سردار نائب السلطنت (سردار نصر اللہ خاں صاحب) سے مل چکے

تو وہ ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان جو لاہور سے یاغستان ہو کر کابل اس ارادہ سے پہنچے تھے کہ ترکی جا کر وہ جنگ میں شریک ہوں گے لیکن کابل میں روک دیئے گئے تھے انھیں حراست سے آزاد کر دیا گیا۔ اور ان کے رہنے کے لئے وہی مکان تجویز ہوا جس میں ہم رہتے تھے۔ ہماری خواہش تھی کہ وہ ترکی جانے کا خیال چھوڑ دیں۔ اور کابل میں ہمارے ساتھ رہ کر حکومت کی مصلحت جس قدر اجازت دیتی ہو اسی قدر کام میں مشغول رہیں۔ وہ جب لاہور سے نکلے تھے تو منظم شکل میں سفر کر رہے تھے مگر کابل میں لاہوری نوجوانوں کے ساتھ چند نوجوان پشاوری بھی شامل ہو گئے۔ اور ان میں اختلاف شروع ہو گیا۔ بیکاری میں آہستہ آہستہ لاہوری جماعت کے افراد بھی کسی قدر مختلف ہوتے رہے ہمیں جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو ہمیں نے پہلے ان کے پرانے نظام کو تازہ کرنے کی کوشش شروع کی، ایک نوجوان عبد الباری ایم اے کو جماعت کا صدر منتخب کیا۔ چونکہ ہندوستانیوں کی ایک جماعت سیاسی سازش کے الزام میں محبوس تھی اور وہ لوگ افغانستان کے محکمہ تعلیمات سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ہم افغانستان میں یہ دلچسپ کام بھی جاری نہیں رکھ سکتے تھے، لیکن جب یہ نوجوان ہمارے ساتھ رہنے لگے تو ہمیں دہلی کے نظارۃ المعارف کا سا لطف آنے لگا۔ ان کے متعلق ہمیں کسی احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ اس جماعت میں کم از کم دس آدمی ایسے تھے جو تین سال سے زیادہ کالج میں پڑھ چکے تھے۔ انھیں ہم نے علیحدہ کر لیا۔ اور کسی قدر مذہبی اور سیاسی اصولوں پر ان سے مذاکرات ہونے لگے۔ اس میں شیخ محمد ابراہیم

اور مولوی محمد علی قصوری بھی شریک تھے۔ اس عرصے میں ہمارے بعض دوست دیوبند سے بھی پہنچ گئے۔ جن میں سے مولانا منصور انصاری تھے جمعیۃ الانصار میں ہم دونوں ساتھ کام کر چکے تھے۔ اور مولانا سیف الرحمٰن دہلی سے یاغستان ہوتے ہوئے کابل پہنچے۔ مولانا سیف الرحمٰن اصل میں قندھاری افغان ہیں۔ ان کے آباو اجداد پشاور کے پاس رہنے لگے۔ انھوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی سے حدیث پڑھی اور زیادہ عرصے تک ٹونک میں پڑھاتے رہے۔ اخیر میں دہلی کے مدرسہ فتحپوری کے مدرسِ اوّل تھے۔ جب حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے مشورہ سے انھوں نے یاغستان کی طرف ہجرت کی تو حاجی ترنگ زئی صاحب کی معیت میں کچھ عرصے جہاد میں شریک رہے، پھر کابل تشریف لائے ان کے وکیل مولانا بشیر احمد جو جماعت اہلِ حدیث لاہور کے معزز کارکن تھے ہجرت کر کے جماعتِ مجاہدین میں رہتے تھے نوجوانوں کی ہجرت میں اُن کا خاص کام تھا۔ وہ بھی اپنی جماعت کے فرائض انجام دینے کے لئے کابل پہنچے۔ ان لوگوں کے مشورے سے ہم نے کام کرنے والوں کی ایک جماعت بنوائی جسے جنوداللہ کہا جاتا ہے۔ اس میں عسکریت بھی تو اسی قدر جتنی کہ سالویشن آرمی میں موجود ہے اس نظام سے ہم نوجوانوں کی باہمی رقابتوں کو دُور کر سکے اور انھیں مغرور طالب علموں کے مغرور نام سے نجات دلانے میں کامیاب ہوئے سرحد میں حاجی ترنگ زئی کے آنے پر افغان مجاہدین کی ایک جماعت

پیدا ہو گئی۔ حاجی ترنگ زئی چونکہ حضرت شیخ الہند کے خاص دوستوں میں سے تھے ان کے ساتھیوں میں سے بہت سے لوگ دیوبند کے پڑھے ہوئے تھے اس لیے جب ان کے وکلاء کابل آئے تو وہ بھی جنود اللہ میں شامل ہو گئے۔

(۵) مشن کی ناکامی اور اعلیٰحضرت کی غداری

ہندوستانی مشن کو اپنے مطلب میں کامیابی نہ ہوئی۔ اعلیٰحضرت اپنے ملک کو جنگ میں دھکیلنا نہیں چاہتے تھے اور انگریزوں سے انھیں بہت سی مراعات کی توقع تھی۔ اس کے مقابل فریق ثانی کوئی تسلی بخش پروگرام نہ بنا سکا اور ممبروں کا انتخاب ہوتے پر سہاگہ کا کام دے گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ مستقبل ہند کے متعلق ہمارے نظریات چونکہ مشن کے ممبروں سے پورے پورے نہ ملتے تھے اس لئے بھی ہمیں دربار میں بڑھنے کا موقع مل گیا۔ حکومت نے مشن کے ممبروں کو آخری جواب دینے سے پہلے ہمیں ان سے ملنے کے سامان بہم پہنچا دیئے جس سے ان کے خواب کو مختلف تعبیروں سے پریشان کرنے کی کوشش کی گئی۔ مشن کی جو گفتگو اعلیٰحضرت سے ہوئی وہ حرف بحرف برٹش قونصل کے ذریعے وائسرائے کو بھیج دی جاتی۔ اس کے معاوضے میں کافی روپیہ انگریزوں نے اعلیٰحضرت کے لئے بھیجا اور ان کی سالانہ گرانٹ میں مستقل اضافہ ہو گیا۔ البتہ سردار نائب السلطنت کی صدارت میں جو باتیں ہوتیں وہ محفوظ رہتیں اور ان سے افغان گورنمنٹ اپنی ترقی

کے لیے راستہ سوچتی۔ اس قسم کے کاموں میں سے ایک کام حکومت متوقتہ ہند کا ہے۔

(۶) روسی مشن اور ہندو ذہنیت کا ایک عجیب منظر

راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ نے مل کر حکومت متوقتہ ہند کی بنیاد ڈالی جس میں بعض جرمن اور ترک بھی شامل ہوئے۔ اس حکومت نے ایک وفد روسی گورنمنٹ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ سردار نائب السلطنت نے منظور کر لیا۔ اس پروگرام پر کام کرنے کے لئے ان کے پاس ہندوستانی نہیں تھے، وہ چاہتے تھے کہ یہ نوجوان ان کے ساتھ کام کریں۔ مگر یہ لوگ ہماری تنظیم میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس لئے ہم سے براہ راست باتیں شروع ہوئیں۔ ہماری ابتدائی گفتگو میں ایک افغان افسر بھی موجود رہتا تھا اور ہمارے تبادلۂ خیالات سے وہ بہت سی ایسی باتوں کو سمجھنے لگا جو پہلے سے اس کی توجہ جذب نہیں کر سکی تھیں۔ ہمارے ساتھ ان نوجوانوں کے علاوہ دو سکھ بھی تھے جو غدر پارٹی کے ممبر تھے۔ اور وہ ہندوستان سے بغیر پاسپورٹ بھاگ کر افغانستان میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ بھی پہلے پولیس کی حفاظت میں تھے پھر آزاد ہو کر ہمارے پاس رہنے لگے تھے۔ راجہ صاحب کی تجویز یہ تھی کہ ان میں سے ڈاکٹر متھرا سنگھ کو اس روسی مشن میں بھیجا جائے۔ مولانا برکت اللہ صاحب مرحوم کی تائید کے بعد دوسرے ممبر اس داخلی مسئلے سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے

وہ موافق ہو گئے۔ اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ فیصلہ شدہ صورت میں ظاہر کیا گیا۔ لیکن ہم ڈاکٹر متھرا سنگھ کی عام سیاسی واقفیت سے آشنا ہو چکے تھے اس لئے اس میں ترمیم پیش کر دی کہ اس مشن میں ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ ایک مسلمان نوجوان بھی ہونا چاہیئے۔ راجہ صاحب نے پسند نہیں کیا اور اس پر بحث چھڑ گئی۔ میرا خیال تھا کہ مسلمانوں کے اشتراک کا یہ مطلب نہیں کہ کام سوچنے والی جماعت میں ایک مغلوب حصہ مسلمانوں کا شامل رہے اور کام کرنے والی طاقت غیر مسلم رہے بلکہ عملی کاموں میں بھی مسلمانوں کی شرکت ضروری ہے۔ اس بحث نے یہاں تک طول کھینچا کہ سردار نائب السلطنت کے سامنے پیش ہوا۔ ترک، جرمن اور افغانستان بھی اس میں شریک ہوئے طرفین کی باتیں سن کر ہماری رائے کے موافق فیصلہ ہوا۔ ہماری اور راجہ صاحب کی تلخ گفتگو کا یہ آخری حصہ ہے۔ اس کے بعد کبھی اس قسم کی ضرورت پیش نہ آئی۔

(۷) تنظیمی برکتوں سے مسلمانوں کی محرومی!

ہم نے نوجوانوں کے رئیس سے اس کام کے لئے ایک ممبر مانگا۔ اس نے اپنی جماعت کے مشوروں کے بعد ڈاکٹر خوشی محمد کو منتخب کیا۔ یہ نوجوان جالندھر کا رہنے والا ہے۔ میڈیکل کالج لاہور میں دو سال سے زیادہ تعلیم حاصل کر چکا ہے۔ مذہبی جذبات جیسے نوجوانوں میں ہوتے ہیں ان میں کسی سے کم نہیں۔ سمجھ دار ہے۔ ہنس مکھ ہے۔ نوجوانوں کی ہجرت

کی تحریک کا لیڈر رہے ہے۔ اس کا نام مرزا محمد علی تجویز کیا گیا۔ اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ دوسرا ممبر قرار پایا۔ شیخ محمد ابراہیم حبیب کابل کو زنے بر میسو ہو گئے تو اسی مرزا محمد علی کو میں نے اپنا رفیق بنایا (قرار دیا) میری جس قدر کامیابی افغانستان اور اس کے بعد روس میں مانی جا سکتی ہے اس میں مرزا محمد علی کی محنت وہمت کا حصہ غالب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر وہ ہمارے ساتھ نہ مل جاتا تو شاید کوئی بڑا کام نہ کر سکتا۔ خدا نے صحیح اشتراک میں قوت رکھی ہے۔ اجزا کے انفرادی قوت میں اضعافاً مضاعفہ قوت نازل ہوتی ہے دو دل یک شود بشکند کوہ را۔ اگر آپس میں کارکن شریک ہو جائیں عقلی اصول صحیحہ پر شرکت ہو۔ عمل اور تقسیم فوائد میں عدل ملحوظ رہے تو نقطان کی طاقت دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایک عالمگیر برادری جو قرآن پر دعوی رکھتی ہے کیا ان میں سے ایک مختصر جماعت سمجھ دار پیدا نہیں ہو سکتی۔ یقیناً ہو سکتی ہے مگر ان کو قرآن پر غور کرنے کی فرصت کہاں۔ مخالفین کے پروپیگنڈے سے مرعوبیت نے انھیں کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کابل سے سفر کرنے سے چند دن پہلے مرزا محمد علی روس کی انقلابی اشتراکی جماعت کا ممبر بن گیا۔ اس کے بعد ہمارا اور ان کا رسمی اشتراک باقی نہیں رہا۔ فقط دوستی اور محبت ہے۔

(۸) مالی طاقت کی اہمیت

راجہ صاحب نے ڈاکٹر متھرا سنگھ کا سفر خرچ دے دیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ

راجہ صاحب پورے مشن کا خرچ دیں گے یا شاید حکومتِ افغانیہ انتظام کر دیگی مگر ایسا نہ ہوا۔ ہماری ساری زندگی ایسی گزری کہ روپیہ پیسے کا کوئی انتظام نہیں۔ جب ضرورت پیش آئی کسی نہ کسی طرح روپیہ مل گیا۔ اس طرح ہمارے دل میں اپنے پروردگار پر زیادہ بھروسہ ہوتا گیا اور اسی کو ہم اپنی زندگی کا روشن پہلو شمار کرتے رہے۔ کابل کا سفر بھی اسی قاعدہ پر تھا جب ہم قندھار پہنچے تو ہمارے پاس فقط ایک پونڈ تھا اور ہم چار آدمی تھے۔ نائب الحکومت نے ہمیں سفر خرچ دے دیا۔ مگر اسے معلوم نہ تھا کہ یہ خالی ہاتھ ہیں۔ جب ہم کابل پہنچے تو ایک مہینے میں ہمارا خرچ ختم ہو گیا۔ اور ہم نے جس قدر کپڑا یا سامانِ راحت خریدا تھا سب بیچ ڈالا۔ اس وقت ہندوستان سے ایک دوست نے کسی قدر روپے بھیجے جب کہیں ہم لوگوں سے ملنے کے قابل کپڑے بنا سکے۔ پھر سردار نائب السلطنت نے بطور مہمانی شاید پانسو روپے بھیجے تو ہمارے بعض ساتھی جو ہندوستان سے واپس ہوئے اُن کی ضرورت میں صرف ہو گیا میں شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ کھانے میں شروع سے شریک ہو گیا تھا۔ مگر اور قسم کی اعانت ہم ان سے نہیں چاہتے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں ہندوستان سے کام کے لئے بہت سا روپیہ لایا ہوں۔ اور میں اُسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب مرزا محمد علی صاحب کا خرچہ دینا ضروری تھا۔ میں نے شیخ محمد ابراہیم سے روپیہ مانگا مگر اس مرحوم نے اس وقت انکار کر دیا۔ اگرچہ بعد میں ان کا تمام روپیہ اور سب سامان اسی کام میں صرف ہوا۔ اپنے فیصلے سے انھوں نے یہ سب کام کیا۔ لیکن اس خاص وقت پر اُن سے غلطی ہو گئی۔ اُن کے دوسرے ساتھی

مولوی محمد علی کا تعارف مولانا ابوالکلام سے کرادیا تھا۔ مگر وہ شیخ محمد ابراہیم کی طرح ہمارے کام میں شریک نہیں تھے۔ خاص مشوروں میں فقط شیخ محمد ابراہیم پر ہمارا اعتماد تھا۔ معاملات میں مولوی محمد علی بھی شریک ہوتے تھے۔ اپنی تکلیف کا ہلکے الفاظ میں اُن سے ذکر کیا، وہ بہت متاثر ہوئے۔ اور انھوں نے جلد اپنی دو ماہ کی تنخواہ پیشگی وصول کر کے ہماری ضروریات پوری کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کا خاص لطف دیکھا اور مولوی محمد علی کے ازحد ممنون ہوئے۔ جیسے آخر میں شیخ محمد ابراہیم کا تمام اندوختہ ہمارے کام میں صرف ہوا اسی طرح مولوی محمد علی نے جس قدر کابل میں کمایا تھا وہ سب ہمارے ہندوستان کے کاموں میں صرف ہوا۔ جزاہم اللہ خیراً! سیاسی کام فقط نظریات یا عملی تجربات کے مالک ہونے سے نہیں چلتے۔ اس کی کامیابی کے لئے ایک مستعد جماعت اور روپے کی بھی ویسے ہی ضرورت ہے جیسے علم و عمل کی۔ ہندوستان کے مسلمان جس قدر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں وہ تھوڑا ہے کہ اُن کے ناموں سے کابل میں بے سروسامانی سے کام شروع ہوتا ہے تو ان کے نوجوان بہترین کارکن ثابت ہوتے ہیں۔ اور روپیہ تو مولوی محمد علی اور شیخ محمد ابراہیم کا تھا جو وقت پر کام آیا۔ ہمارا خیال ہے کہ ان لوگوں کا نام قوم کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہئے۔ اور ہم اُن کے لئے دعائے خیر کرنی چاہئے۔

(۹) ہندو عصبیت کا ایک مظاہرہ

اس مشن کے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے جرمن ممبروں سے زیادہ ملنا

شروع کر دیا۔ اس میں ہمارے دوست عبدالباری بی اے کی رفاقت ہمارے کام آئی۔ راجہ صاحب نہیں چاہتے تھے کہ وہ (جرمن ممبر) کسی دوسرے ہندوستانی سے ملیں۔ ہماری ملاقاتوں کا تسلسل دیکھ کر راجہ صاحب نے ہمیں حکومت موقتہ ہند میں شمولیت کی دعوت دی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید ہم اس میں شامل ہونا پسند نہ کریں گے کیونکہ اس کا جس قدر انتظام ان دونوں صاحبوں نے تجویز کیا تھا اس میں راجہ صاحب کے نام حلف ضروری تھا مگر میں نہایت مسرت سے اس میں شامل ہو گیا۔ البتہ حلف نامہ تبدیل کرایا۔ جسے انھوں نے منظور کر لیا۔ اس کے بعد ہندوستانی معاملات میں ہماری گفتگو بیرونی مداخلت سے پاک ہو گئی۔ ابتدا میں حکومت موقتہ کے تین ممبر رہے۔ امیر امان اللہ خاں کے زمانے میں جنگِ افغانستان کے خاتمے پر اور ممبر بڑھا لیے گئے۔ اس میں جماعتِ مجاہدین کے وکیل مولانا محمد بشیر صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

راجہ صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں مگر اپنی شخصی ڈکٹیٹرشپ کا خیال ان کے دماغ پر غالب تھا۔ یورپین لوگوں سے وہ ان کی زبان میں باتیں کر لیتے اور ڈیموکریسی کے لیکچر دے ڈالتے۔ لیکن ہندوستانی معاملات میں ان کی موروثی خصلت نمایاں رہتی۔ ہم نے بڑے داؤ پیچ سے انھیں زخمی کیا کہ حکومت موقتہ اپنا چارج اس جماعت کو دے دے جسے انڈین نیشنل نے اس کام کے لیے منتخب کیا ہو۔ اور وہ لائف پریزیڈنٹ اپنے ہی تجویز کردہ قانون سے مقرر ہو چکے تھے۔

ہندستانی نوجوانوں کے کارنامے

جب پہلی بار راجہ صاحب نے کابل چھوڑا تو حکومت موقتہ کے لئے تین مرکز تجویز ہوئے۔ کابل، نیپال، بنگال شمال مشرقی، کابل کے مرکز میں کام ہمیں تفویض ہوا۔ اس کے بعد ہم نے جنود اللہ اور باقی تمام کارروائیوں کو حکومت موقتہ مرکز کابل سے متعلق کر دیا۔ امیر امان اللہ خاں صاحب جب برسر اقتدار ہوئے تو انھوں نے حکومت موقتہ ہند کا نمائندہ مان کر سرکاری معاملات صلح و حرب میں شریک کر لیا۔ جب جنگ کا فیصلہ ہونے لگا تو اس خاص مجلس میں مجھے بلا کر سرفراز فرمایا۔ دوران جنگ میں بعض اہم امور میرے حوالے کئے گئے۔ جنگ ختم ہونے پر اچھی کامیابی حاصل کرنے میں ہماری خدمات خاص طور پر تسلیم کی گئیں۔ اس تمام زمانے میں ہمارے نوجوان رفیقوں کے کارنامے سنہری حرفوں میں لکھے جائیں گے۔ اگرچہ ایک زمانے تک ان پر پردہ ڈالنا ضروری ہے۔ جب جنگ ختم ہونے پر راجہ صاحب دوبارہ کابل تشریف لائے، تو امیر امان اللہ خاں نے ان کے اعزاز میں ایسے کام کئے جن کی راجہ صاحب کبھی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اس میں امیر صاحب نے ہمارے مشورے حرف بحرف قبول فرمائے۔

آخری سال جب ہم کابل سے رخصت ہوئے، امیر صاحب نے ہمیں افغانستان میں رہ کر حکومت ہند کا کام کرنے سے روک دیا۔ انٹرنیشنل سیاسیات کی پابندی ضروری ہے۔ ہم نے ایک شرط پر اسے منظور کر لیا۔ جب وہ وعدہ کرنے میں

تعلق نظر آیا تو ہم نے افغانستان سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں بذاتِ خود تھوڑے سے تغیر کے بعد آرام و عزت سے کابل میں رہ سکتا تھا مگر میرے نوجوان رفیقان (جن کی شفقتیں ہماری عزت افزائی کا سبب بنی تھی) کا مستقبل برباد ہو جاتا اس لئے میں کابل سے نکلنا ضروری سمجھتا تھا۔ اب ہم اطمینان سے مجتمع نہیں رہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فلاں نے اپنے فائدے کے لئے دوسروں کا نقصان کر دیا۔ اگر کبھی موقع میسر آیا تو تمام دوست پھر یکجا ہو جائیں گے۔ واللہ الموفق والمعین!

(ذاتی ڈائری صفحہ ۹۹ تا ۱۰۰)

(۱۱) روسی مشن کا انجام

ڈاکٹر متھرا سنگھ اور مرزا محمد علی روسی مشن بھیج دیئے گئے اور ممبروں کے ساتھ دو خادم بھی روانہ کئے گئے۔ محمد علی کا خادم افغان تھا اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کا خادم ایک کابلی سکھ مشن ترمز سے تاشقند پہنچا، گورنر نے زار کو مطلع کر دیا۔ وہ اس وقت پریشان تھا۔ اس نے برطانیہ سے بہت سے مطالبات شروع کر دیئے اور اس مشن کی کارروائی بہانہ بنائی۔ برطانیہ مشن کو جعلی قرار دیتا ہے لیکن روس اسے تسلیم نہیں کرتا اور افغانی حملے سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ برطانیہ ہندوستان سے ممبروں کی تشخیص کراتا ہے۔ مگر صحیح طور سے معین نہ ہو سکے بالآخر زار نے ممبروں کے گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ مگر گورنر تاشقند کی مداخلت سے یہ لوگ قید سے بچ گئے۔ یہ مشن بیکار ثابت نہیں ہوا۔ روسی انگریزی اتحاد میں کسی

قادر مشکلات پیدا کر سکا۔ جس کی تلافی کے لئے لارڈ کچنر کو خود سفر کرنا پڑا۔ روسی انقلابیوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا نام ہے (سونے کی پٹڑی، جو سونے کی پٹڑی پر کندہ کرایا گیا تھا) ایک خط گورنر تاشقند کے نام تھا۔ اس میں اس مشن کے متعلق خط و کتابت مذکور ہے۔ جب مشن واپس آیا تو ڈاکٹر متھرا سنگھ اور محمد علی کو سردار نائب السلطنت نے بلایا۔ اور سفر کی کیفیت پوچھی۔ محمد علی نے تمام واقعات کی مختصر یادداشتیں لکھ رکھی تھیں۔ جیب سے اپنی کتاب نکالی۔ اور مفصل حالات اور گفت و شنید کا خلاصہ سب ذکر کر دیا۔[1] اس کے بعد سردار نائب السلطنت ہماری بہت زیادہ قدر کرنے لگے۔ انھوں نے خاص لوگوں سے کہا کہ اگر ہم مولانا عبید اللہ کی بات نہ مانتے تو راجہ صاحب کا فرستادہ ہمیں ایک حرف بھی نہ بتلاتا۔

(۱۲) حکومت برطانیہ کی فریب دہی کی ایک مثال

ہماری تربیت ہندوستانی تعلیمات میں علمائے دیوبند کے مسلک پر ہوئی ہے۔ دیوبندی جماعت فقہ حنفیہ کی پابند ہے۔ لیکن بہت سے غلط رسوم کی تردید میں مولانا اسمٰعیل شہید رح کے طریقہ پر ہے۔ اس میں یہاں تک مبالغہ کیا جاتا ہے کہ مولانا اسمٰعیل شہید کے اصل اتباع یہ لوگ اپنے سوا کسی کو نہیں مانتے۔ سندھ میں میں نے بیس سال زندگی بسر کی ہے۔ میرے بزرگ سب اس دیوبندی مسلک سے ملتے جلتے ہیں۔ اگرچہ علمائے دیوبند سے ان کے افادہ اور استفادہ کا

[1] متھرا سنگھ کچھ نہ بنا سکے۔

کوئی رابطہ نہیں ۔ ان کے مخالف سندھ میں پیروں اور مولویوں کی تعداد کافی ہے ۔ ہندوستانی حکومت نے ان میں سے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جن کا قندھار کے پیروں سے بہت قوی تعلق تھا ۔ ان قندھاری بزرگوں میں سے ایک پیر کابل تشریف لائے اور سردار نائب السلطنت سے ملے اور انھیں یقین دلایا کہ مولانا عبید اللہ حکومت ہند کا فرستادہ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ افغانستان کے لوگوں کا مذہب خراب کر کے افغانستانی حکومت کے اسرار سے انگریزوں کو مطلع کرے ۔ سردار نائب السلطنت کے سکریٹری نے ہم سے ذکر کیا ۔ ہم نے اس کو تھوڑا سا سمجھا دیا کہ ہمارے متعلق وہ افغان سی ۔ آئی ۔ ڈی کے افسروں کو مقرر کر کے حکومت کی رائے معلوم کریں ۔ اس پر جس قدر سزا ہو اس سے دریغ نہ کریں ۔ اگر ذرا بھی شبہ ہو تو مجھے توپ سے اڑا دیا جائے دوسری صورت میں جہاں سے میں آج کام چھوڑ رہا ہوں وہیں سے شروع کر دوں گا ۔ گویا یہ زمانہ بیماری کی رخصت میں شمار ہو گا غالباً یہ تجویز سردار کو پسند آئی اور اسی پر عمل کیا گیا ۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ان افغان خفیہ نویسوں نے کہا کہ اس شخص (قندھاری پیر) کے نامۂ اعمال میں ایک نقطہ بھی سفید نہیں رہا ۔ اس کے بعد سردار نائب السلطنت نے ہمیں خاص طور سے باریاب فرمایا اور ہم اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے ۔"

(۱۳) جاپانی اور استنبولی مشن

پہلے مشن کی کامیابی میں راجہ صاحب نے دو مشن اور بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ہماری منشا کے مطابق استنبول بھیجا گیا۔ اس میں ہمارا رفیق عبدالباری بی۔ اے اور ڈاکٹر شجاع اللہ مقرر ہوتے۔ یہ ایران کے راستے استنبول جائے گا۔ دوسرا مشن مولانا برکت اللہ کی تجویز پر مقرر ہوا۔ اس میں شیخ عبدالقادر بی۔ اے اور ڈاکٹر متھرا سنگھ روس کے راستے جاپان جائیں گے۔ کیپٹن ہنٹش (جرمن ممبر) ہم سے پہلے کابل کو واپس گئے۔ امیر صاحب نے رخصت کا فرمان دے دیا وہ جاتے وقت تین سو پونڈ میرے نام چھوڑ گئے۔ راجہ صاحب نے حکم دیا کہ وصول کر لوں۔ ان میں سے ایک سو پونڈ تو راجہ صاحب اور مولانا برکت اللہ نے اپنے کپڑے تیار کرنے کے لئے لے گئے اور دو سو پونڈ مولانا محمد ابراہیم کے پاس امانت رکھ دیئے۔ شیخ محمد ابراہیم اور مولانا محمد علی اور میرا بھتیجا عزیز احمد جس گھر میں رہتے تھے اس پر رات کو ڈاکہ پڑا اور وہ تمام روپیہ اور ان دونوں صاحبوں کے کپڑے اور سامان ڈاکو لے گئے۔ مجھے خطرہ ہوا کہ راجہ صاحب اس ڈاکے کو ہمارے روپیہ ہضم کرنے کا بہانہ تصور کریں گے۔ جب استنبول جانے کا وقت آیا تو اس کے لئے سو پونڈ مولانا محمد بشیر وکیل رئیس المجاہدین سے قرض لے کر ادا کر دیئے گئے۔ مولانا محمد بشیر صاحب کا یہ احسان میں

کبھی نہیں بھول سکتا۔ قرض کا تو فقط نام تھا۔ اگرچہ بعد میں مرزا محمد علی نے ادا کر دیا۔ دوسرے مشن کی روانگی سے پہلے سرکاری طور پر ڈاکہ کی تصدیق ہو چکی تھی۔ اور چوروں کے پاس روپیہ کا ثبوت ہو چکا تھا۔ اگرچہ ہمیں اس میں سے کچھ بھی نہیں ملا اب راجہ صاحب کے کہنے سے میں مولانا برکت اللہ کے ساتھ سردار نائب السلطنت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس واقعے میں روپیہ ضائع ہونے کا ذکر کیا۔ ایک سو پونڈ کی ضرورت ظاہر کی۔ سردار صاحب نے بکمال مہربانی وعدہ فرمایا اور شام کو خود سو پونڈ ساتھ لائے اس طرح دوسرا مشن بھی روانہ ہو گیا۔

(۱۴) دونوں مشنوں کا انجام

روس نے دوسرے مشن کو جب ان کی سرحد عبور کر چکا تو گرفتار کر لیا اور انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ استنبول مشن کو ایران میں خود انگریزوں نے گرفتار کر لیا۔ چار ممبر لاہور پہنچے۔ ڈاکٹر متھرا سنگھ چونکہ ایک بم کیس میں مفرور تھا اُسے پھانسی پر لٹکایا گیا اور باقی تین ممبر نظربند کر دیئے گئے۔ اُن میں سے عبدالباری جو ہر ایک موقع پر ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ اور نوجوانوں کی جماعت کا لیڈر تھا۔ سر محمد شفیع کا رشتہ دار نکلا۔ اس کو معافی مانگنے پر راضی کیا گیا اُس نے تمام واقعات حکومت موقتہ کے اور جنود اللہ کے اور جماعت مجاہدین کے مفصل لکھ دیئے۔ اور باقی دو ممبروں نے اس پر دستخط کر دیئے۔ کچھ عرصہ نظربند رکھ کر ان کو چھوڑ دیا گیا۔ حکومت ہند کو مشن

کے زمانے سے واقعات کی تحقیق کے لئے پریشان تھی۔ اب اسے باطمینان مفصل حالات کی اطلاع مل گئی۔

(۱۵) مرکز کابل کے قائدین کا حشر

حکومتِ ہند ان اطلاعات کے بعد ایسے عناصر کا کابل میں موجود ہونا کیسے گوارا کر سکتی تھی۔ اُس نے پرزور پروٹسٹ کیا۔ اس کے پروٹسٹ کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی حبیبیہ اسکول سے معزول کر دیئے گئے اور میرا بھتیجا عزیز احمد جو حبیبیہ اسکول کا طالب علم تھا خارج کر دیا گیا۔ آج عزیز احمد کے ہم جماعت کونسل اور نائب وزیر اور جرنیل اور ممبر بن گئے۔ اور یہ باوجودیکہ علمی اور عملی لیاقت میں ان سے کسی طرح کم نہیں تھا اسی طرح جوتے چٹخاتا پھرتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنی حکومت ضائع کر کے اپنی نسلیں برباد کر رہے ہیں۔ شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی نے فیصلہ کیا کہ وہ یاغستان میں رہیں گے۔ پہلے دونوں مجاہدین کابل میں رہے پھر شیخ محمد ابراہیم حاجی ترنگ زئی کے پاس چلے گئے۔ اور پشتو سیکھ کر لوگوں کو قرآن شریف کی تعلیم دیتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد افغانستان سے گزر کر روس پہنچنے کی کوشش کی۔ راستے میں ایک گاؤں میں فوت ہو گئے۔ شبہ کیا جاتا ہے کہ ٹا کو یاغستان سے ان کے ساتھ تھا۔ اس نے شیخ صاحب کو شہید کر دیا۔ آخری وقت میں شیخ محمد ابراہیم نے دوسرے ساتھی کو ایک خط لکھ دیا۔ وہ میں نے پڑھا ہے۔ اس کے ایک لفظ سے شبہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب سمجھاتا چاہتے

ہیں کہ بہت ممکن ہے کہ وہ ڈاکو نہ ہو بلکہ انگریزوں کا ایک کارندہ ہو۔ شیخ محمد ابراہیم نے یہ سفر انقلاب روس کے بعد شروع کیا تھا۔ مولوی محمد علی قصوری کچھ عرصے تک مجاہدین میں رہے اور پھر کسی طرح سر عبدالقیوم کی معرفت معافی لے کر ہندوستان پہنچ گئے۔ اُن کے بیانات سے بھی ہندوستانی گورمنٹ کے علم میں کچھ اضافہ ہوا۔

(۱۶) ریشمی خط کا اجمالی اشارہ

جب یہ دونوں حضرات یاغستان جا رہے تھے ان کے ساتھ ایک ہندوستانی مشن بھی بھیجا گیا۔ ہم جب کابل پہنچے تو وہاں سے ساتھی واپس بھیجے تھے۔ ان کے پاس بعض کاغذات اور پیام تھے۔ انھوں نے احتیاط اور آہستگی سے کام لیا۔ اب راجہ مہندر پرتاپ چاہتے تھے کہ ان کی اطلاع اُن کے بھائیوں کو ملے اور وہاں سے خیریت کی خبر آئے۔ اس کے لئے ہم نے اپنے بھتیجے محمد علی کو مامور کیا۔ وہ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ یاغستان گیا اور وہاں سے منزلِ مقصود پر پہنچ کر خط پہنچا دیا۔ جواب لے کر دو مہینے میں بخیریت پہنچ گیا مگر راجہ صاحب اس سے پہلے کابل چھوڑ چکے تھے۔ اُن کا خط انھیں مزار شریف میں پہنچا دیا گیا۔ اور راجہ صاحب اس سے بہت مسرور و ممنون ہوئے اس کے بعد راجہ صاحب ہم سے بھائیوں کا سا معاملہ کرتے رہے۔ اپنے پرائیوٹ امور میں بھی ہم سے مشورہ لیتے رہے اور بسا اوقات ہماری خاطر اپنی رائے چھوڑ دیتے۔ اس مشن کا ایک حصہ وہ کاغذات تھے جو میں نے اور مولانا منصور

نے حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں بطور رپورٹ لکھے تھے۔ ہم نے نوجوانوں میں سے ایک نومسلم شیخ عبدالحق پر اعتماد کیا۔ اس کے کپڑے پر لکھ کر مکتوبات دیئے کہ وہ شیخ عبدالرحیم کو پہنچادیں۔ کہ شیخ صاحب حج کو جائیں اور حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کریں۔ اس اللہ کے بندے نے وہ خطوط اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر حق نواز خاں کو دیئے۔ خان صاحب نے سر مائیکل اڈوائر کو پہنچائے۔ اس کے بعد کے واقعات مشہور ہیں ہندوستان میں گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ ہم حیران رہ گئے۔ چند روز بعد حضرت شیخ الہند اور رفقاء مکہ معظمہ میں گرفتار ہوئے۔ ایک عرصے کے بعد ہمیں حقیقت معلوم ہوئی۔ یہ واقعات ہمارے لئے موت سے زیادہ ناگوار تھے مگر ایک بات کی مسرت بھول نہیں سکتے تھے۔ اگر خدانخواستہ راجہ صاحب کا خط ہم عبدالحق کو دیتے اور ایسا معاملہ پیش آتا تو ہمارے لئے ناقابل برداشت مصیبت ہوتی۔ اب ہم خوش ہیں کہ راجہ صاحب کا کام تو ہو گیا گو ہمارے لوگ قید و مصیبت میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لئے آسانی کر دے گا!

(۱۷) مولوی سیف الرحمٰن کی کمزوری یا بددیانتی

اس کے بعد ہندوستانی حکومت کے اعتراض (پروٹسٹ) کا اثر یہ ہوا کہ مولانا منصور انصاری اور مولانا سیف الرحمٰن کابل سے یاغستان روانہ کر دیئے گئے۔ جلال آباد تک دونوں ساتھ رہے۔ مولانا سیف الرحمٰن صاحب کو جلال آباد میں برٹش افغانوں نے اپنی معیت میں لے لیا اور ہندوستانی معاملات

سے علیحدگی کا وعدہ کرالیا۔ اب وہ مستوفی الممالک کے مہمان ہو کر رہنے لگے۔ امیر حبیب اللہ کی آخری حکومت تک وہ مستوفی کے ساتھ رہے اور مستوفی کو جو کام انگریزوں کی تائید کے لئے دیا جاتا انہیں انکی امداد کرتے۔

(۱۸) ایک پُر اسرار خط کے متعلق مولوی حبیب کوڑ صاحب کی جاسوسی

ہندوستانی حکومت کو اطلاع ملی کہ حضرت مولانا شیخ الہند نے ایک خط انور پاشا سے لے کر ہندوستان بھیجا ہے اور اکابر دیوبند کے پاس کہیں محفوظ ہے اس لئے ہندوستان میں جس قدر کوشش ہوئی اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اب جب امیر حبیب اللہ خاں کی حکومت سے امداد لی گئی تو مستوفی الممالک نے دیوبند کے ایک پرانے طالب علم کو جو حضرت شیخ الہند سے خصوصیت رکھتا تھا افغانستان میں سے ڈھونڈھ نکالا۔ اسے دیوبند بھیجا گیا کہ اعلیٰ حضرت امیر صاحب وہ کاغذ مانگتے ہیں۔ اس میں اگر مولانا سیف الدین کی واقفیت مستوفی کی امداد نہ کرتی تو یہ تجویز بروئے کار ہی نہ آسکتی۔ اس دیوبندی بزرگ کا پتا بھی مولانا سیف الرحمٰن سے دریافت کر لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس بزرگ کو کچھ شکوک پیدا ہوئے اس لئے خط نہیں ہاتھ لگا۔ اس کے بعد احتیاط پسند لوگوں نے وہ خط جلا دیا۔

حبیب اللہ خاں کا قتل اور ہمارے مصائب کا خاتمہ

مولانا منصور انصاری افغانستان سے یاغستان چلے گئے اور ایک زمانے

تک وہیں رہے۔ اس کے بعد ہمیں یکم رمضان ۱۳۳۵ھ کو ایک تنگ مکان میں لا کر قید کر دیا گیا۔ ہم بیس پچیس آدمی تھے اور وہ گھر کسی حالت میں دس سے زیادہ آدمیوں کے لئے موزوں نہ تھا۔ ہماری نگرانی سردار سپہ سالار کے متعلق رکھی تھی (یعنی سردار محمد نادر خاں) انھیں ہم نے توجہ دلائی۔ اس نے ہمارے لئے ایک سرکاری باغ میں خیمے لگوائے اور عید الفطر پر خود ہمارے خیموں میں تشریف لائے۔ ایک عرصے کے بعد ہماری نگرانی مستوفی الممالک کے سپرد کی گئی۔ اب ہم نے مولانا سیف الرحمٰن کی امداد سے مستوفی کے گھر رہنا شروع کر دیا۔ ہمارے ساتھی اسی طرح کوتوال کی حفاظت میں رہے ہمارا ایک رفیق اس مجلس سے بھاگ گیا۔ اور انقلاب روس کے بعد بخارا پہنچا۔ اس کا نام رحمت علی زکریا ہے، اس نے اپنی تجویز ہمیں بتلا دی تھی اس کو ہم منع کرنا نہیں چاہتے تھے اور ہمیں خوف تھا کہ اس کے بھاگنے کا تمام الزام ہم پر عائد کیا جائے گا۔ اس لئے ہم نے مولانا سیف الرحمٰن کے توسط سے اُن لوگوں سے کہلا دیا کہ یہ معاملہ ہے مستوفی الممالک ہمیں جلال آباد لے گئے۔ ہم وہیں تھے کہ امیر حبیب اللہ خاں قتل کر دیا گیا اور کابل میں امیر امان اللہ خاں متقل بادشاہ بن گیا۔

(ذاتی ڈائری از صفحہ ۱۳ تا ۲۲)

امان اللہ خاں کا دور اور ہم

سردار امان اللہ خاں سے بارہا ملنا ہوا۔ مگر جب ان سے ملتے تو ایسا

معلوم ہوتا جیسے ایک بادشاہ ہونے والے شہزادے سے مل رہے ہیں
جب ہم انگریزی حکم سے جلال آباد میں مستوفی الممالک کی زیر نگرانی نظر بند
تھے تو ہمیں ایک ضرورت کے لئے بارہ سو روپے کی ضرورت پڑی۔
ہم نے اپنی ضرورت خفیہ امان اللہ خاں کے پاس لکھ بھیجی۔ چنانچہ
دو دن بعد شام کو سردار امان اللہ خاں نے بارہ سو روپیہ مخفی طور پر
ہمارے پاس بھیج دیا۔ اور ہم نے اپنی ضرورت پوری کی۔ جب امیر صاحب
مستقل طور پر بادشاہ ہوئے تو ہمیں رہا کر دیا گیا۔ چنانچہ رہائی کے
بعد پہلی دفعہ جب کابل میں ملاقات ہوئی تو ہمارے سامنے آتے ہی
سردار صاحب نے فرمایا۔ من ہم ہستم۔ ان خاص ملاقاتوں کی طرف اشارہ
تھا۔ اس کے بعد ہم نے بھی امیر صاحب کی خیر خواہی میں کوئی کمی نہیں
کی۔ اور ہمارے نوجوان رفیقوں نے بھی خوب کارہائے نمایاں
انجام دیئے خصوصاً دورانِ جنگ میں۔

افغانستان میں ہم ۱۹۲۲ء تک مقیم رہے۔ پھر بعض انٹرنیشنل
سیاسیات کی بنا پر ہم نے کابل چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ بالآخر
نومبر ۱۹۲۲ء کو ہم نے دریائے جیحون عبور کیا۔ اور سوویٹ روس علاقہ
میں داخل ہو گئے۔ اس عرصے میں جیسے ہم نے امیر امان اللہ کی بہی خواہی
میں کوئی کمی نہیں کی ایسے ہی امیر صاحب نے بھی ہمیں نوازشوں سے
نوازا۔ ہمیں اپنی حکومت کی جھلک نظر آنے لگی۔ ہو سکتا تھا کہ ہم تھوڑی
ترمیم کر لیتے اپنے نظام میں اور شاہی بھائی کا لطف اٹھاتے رہتے

مگر اپنے نوجوانوں کی زندگی اس طرح ہم تباہ کر دیتے۔ ان کی خاطر ہم نے ہجرت کو ترجیح دی۔ اور آخر کابل کو الوداع کہا۔

(ذاتی ڈائری ص ۱۳۲ ملخصاً)

مولانا سندھی کی ذاتی ڈائری پر تبصرہ

ہم نے یہاں ڈائری سے صرف بیس اقتباسات نقل کر دیئے ہیں جن سے ہمارے موضوع میں مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان میں مقامات کی بلیغانہ عبارتوں کو بار بار پڑھیئے اور اصل واقعات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کیجیئے۔ آپ کو بہت سی معلومات حاصل ہوں گی جن کی تفصیل ہم بھی نہیں کر سکے۔ درحقیقت حضرت سندھی مرحوم نے یہ ذاتی ڈائری انگریزی حکومت کے دور میں لکھی ہے اور اس زمانہ میں واقعات کو تفصیلاً لکھنا ناممکن تھا اس لئے حضرت نے واقعات کو اشارات سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے تفصیل نقل کرنے کے بعد پھر بھی مناسب سمجھا کہ حضرت کی اصل عبارت کو ہی نقل کر دیں تاکہ قارئین کرام خود بعض اہم باتوں سے مطلع ہو جائیں اور بہت ممکن ہے کہ بعض تفصیلات ہم سے رہ گئی ہوں تو قارئین خود ہی ان کو سمجھ لیں۔ اس لئے بغیر کسی ترمیم و اضافہ کے ذاتی ڈائری کے وہ وہ مقامات بجنسہٖ نقل کر دیئے جن کا تعلق اس واقعے سے تھا۔

وما علینا الا البلاغ!

اب ہم یہاں سے تیسرا باب یعنی اسباب ناکامی کو شروع کرتے

ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت مدنی کی کتاب یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تیسرا باب میرا اپنا لکھا ہوا ہے۔ البتہ بعض مضامین کا ماخذ حضرت کی کتابیں ہیں۔ لیکن مضمون بہر حال میرا ہے اس کی ذمہ داری میری ہے نہ کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ کی۔ رحمۃ اللہ علیہ و مغفرتہٗ۔ آمین!

تیسرا باب

اسباب ناکامی

اعتمادِ باہمی اور اسکی مفرطانہ بے راہ روی

قدرت نے بنی نوع انسان کو اجتماعی اور عمرانی معاملات کی انجام دہی کے لئے قوتِ اعتماد عطا فرمائی ہے جس کو عمرانیات کے ماہرین اعتمادِ باہمی کی قوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ عمرانیات و اجتماعیات کے سب معاملات کی انجام پذیرائی درحقیقت اسی قوت کا کام ہے۔ اسی قوت کی بدولت معاہدہ عمرانی اور دیگر عقود و مواعید منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ اگر یہ قوت نہ ہو تو اجتماعیات کا سلسلہ درہم برہم ہو جائے۔ یہی اعتماد باہمی کی قوت سیاسیات و معاشیات، اخلاقیات و معاشریات میں بنی نوع انسان کو باہمد گر مربوط رکھتی ہے۔ لیکن ہر قوت انسانی کی طرح اس میں بھی ایک درجہ اعتدال کا ہے۔ اور دو پہلو افراط و تفریط کے۔ اس کے اعتدال کی بدولت قومیں کامیابی و کامرانی سے ہم کنار ہوتی ہیں اور افراط و تفریط کے ذریعے سے قومیں ناکام ہوتی ہیں۔ اعتماد باہمی کا اعتدال یہ ہے کہ جن افراد پر اعتماد کیا جائے وہ واقعی اعتماد کے قابل ہوں۔ اگر اعتماد کے قابل مخلصوں پر بھی

اعتماد نہ کیا جائے تو یہ اس قوت کا تفریطی پہلو ہے جس کو سوءِ ظن اور بداعتمادی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اگر ایسے لوگوں پر بھی اعتماد کیا جائے جو کہ غدار و غیر مخلص ہوں تو یہ اس قوت کا افراطی پہلو ہے جس کو حسنِ اعتماد اور حسنِ ظن سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سوءِ ظن رکھنے والا آدمی زیادہ سے زیادہ اپنے دوست و معاون نہیں بنا سکتا مگر ضرر و نقصان سے ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔ لیکن حسنِ ظن رکھنے والا گو بہت سے دوست بنانے میں کامیاب رہتا ہے مگر ہمیشہ نقصان اٹھاتا ہے۔ گویا یہاں افراط بہ نسبت تفریط کے زیادہ ضرر رساں ہے۔ بجز پیغمبروں کے اس کمزوری کا شکار ہر کوئی ہو جاتا ہے کہ ہر آدمی پر اعتماد کر لیتا ہے اور آخر نقصان اٹھاتا ہے۔ اگر انبیاء کی بھی توفیق خداوندی دستگیری نہ کرتی تو شاید اس کمزوری سے نہ بچ سکتے۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس مرض حسنِ ظن میں عموماً نیک لوگوں کو ضرر پہنچتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی لوگ عموماً اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی باطنی صفائی کی وجہ سے دوسرے کے شیشۂ قلب میں اپنی ہی صورت دیکھتے ہیں اور ان کو ہر آدمی کے شیشۂ قلب میں نیکوئی اور خوبی ہی نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ وہ ان کی اپنی نیکوئی ہوتی ہے جو دوسرے کے اندر منعکس ہو گئی ہوتی ہے۔ پھر یہ لوگ ہر شخص کو اپنے جیسا مخلص و دیانت دار سمجھتے ہیں اور دوست و دشمن میں تمیز نہیں کر سکتے یا نہیں کرتے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اپنے دوست ہی ان کو نقصان پہنچانے کے در پے ہوتے ہیں اور یہ ان کو دوست سمجھتے ہوئے ان کے ضرر رساں ارادوں سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔

سیاست ہی نہیں بلکہ مذہب کے معاملے میں بھی اس کمزوری نے مسلمان رہنماؤں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ اگر محدثین کی جماعت سوءِ ظن و تنقید علمی سے کام نہ لیتی تو علمِ حدیث آج اکاذیب و خرافات کا پلندہ بن جاتا اور یہ سب کچھ ان صوفیاء کرام کے حسنِ ظن سے ہوتا جو خود یقیناً نیک و مخلص تھے مگر حُسنِ ظن کے غلبے نے ان کو اس حد تک مغلوب کر دیا تھا کہ جو حدیث کسی سے سُنی اس کو حدیث سمجھ لیا۔ کہ کوئی مسلمان ہو کر حضور پر کس طرح افترا پردازی کر سکتا ہے نتیجہ یہ نکلا کہ صوفیائے کرام کی کتابوں میں ضعیف اور موضوع احادیث کے انبار لگ گئے۔ آخر محدثین کو یہ اصول مقرر کرنے پڑے کہ کسی صوفی کی حدیث قبول نہ کی جائے۔

افراط و تفریط کے ثمرات

غرضیکہ مذہبیات ہوں یا سیاسیات ہر جگہ نقصان ہمیشہ حُسنِ ظن کے مریضوں کو پہنچا ہے۔ سوءِ ظن کے مریض گو ہیں تو وہ بھی مریض اور صحیح راہ تو راہِ اعتدال ہے مگر وہ ہمیشہ نقصان سے محفوظ رہتے ہیں۔ آخر حضرت عمر رضؓ کی سختی تھی کہ وہ حسنِ ظن نہیں رکھتے تھے اور ہر شخص پر اعتماد کر لینے کے قائل نہ تھے۔ تب ہی تو وہ دُنیا بھر کا کام کر سکے۔ ورنہ حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علیؓ دونوں کو نقصان پہنچانے اور آخر شہید کرنے یا کروانے والے اپنے دوستوں ہی میں سے تو تھے سب سے پہلی تحریک۔ جو کسی ظالم حکومت کے خلاف چلائی گئی وہ حضرت امام حسین رضؓ کی تحریکِ انقلاب ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ وہی کوفی جو آپ کے محب و فدائی کہلاتے تھے اور آپ کو خطوط لکھ کر کوفہ بلایا تھا اور آپ کی دوستی کا اظہار کیا تھا کیا آخر یہی لوگ آپ کے قاتل نہ تھے؟ انہی لوگوں پر حضرت حسین رضؓ نے اعتماد کیا اور انہی کے ہاتھوں شہید ہوئے

کیا حضرت امام ابو حنیفہؒ کو قید کرنے والے اور زہر کھلا کر شہید کرنے والے آپ کے شاگرد و مرید نہ تھے۔ کیا مرزا مظہر جان جاناں کو شہید کرنے والے اپنے مرید نہ تھے۔ اور کیا حضرت مجدد الف ثانیؒ کو قید کروانے والے اور سازش کرنے والے آپ کے حلقہ بگوش مرید ہی نہ تھے۔ اور کیا شاہ ولی اللہؒ کے پہنچے اتروانے کا فتویٰ دینے والے اور آپ کو قید کروانے کی ناکام سازش کرنے والے آپ کے شاگرد و مرید ہی نہ تھے۔ اور کیا سید احمد شہیدؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ کو بالاکوٹ کی وادی میں شہید کروانے والے اپنے ہی مسلمان مرید نہ تھے۔ کیا وہ ہندو تھے؟ اور دور کیوں جاتے ہیں، آیئے ذرا تحریک انقلاب ۱۸۵۷ء کا جائزہ لیں۔ کیا مسلمانوں کو شکست دینے والا انگریز تھا۔ کیا حکیم احسن اللہ خاں، منشی رجب علی، مولوی عبدالقادر اور مولوی ذکاء اللہ جاسوسانِ انگریز اور روسائے پنجاب مددگاران برطانیہ و جاگیر داران بیت کاسہ لیسان برطانیہ یہ کون لوگ تھے۔ یہ سب اپنے ہی تو تھے۔ اور اپنے ہی دوستوں نے آخر تحریک کو ناکام بنایا تھا۔ بات طویل ہو گئی۔ خلاصہ کلام یہ کہ حسن اعتمادی اور خوش ظنی کی کمزوری نے ہمیشہ سیاسی تحریکوں کو ناکام بنایا ہے اور یہی وہ بلا ہے کہ جس سے انبیاء صرف محفوظ و معصوم ہوتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر بڑے بڑے مخلص و جاں باز، پرہیزگار و متقی بزرگ اس کا شکار ہو جاتے ہیں اور آخر کار نقصان اٹھاتے ہیں۔ اور اس کی وجہ ان حضرات کی کچھ برائی یا بدی نہیں ہوتی بلکہ ان کی نیکوئی ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ لوگ نیکوئی و دیانت داری میں اس طرح فنا ہو جاتے ہیں کہ ان کو ہر کسی کا قلب و ارادہ نیک ہی نظر آتا ہے یہ حقیقتاً

ان بزرگوں کا حال ہوتا ہے جو کہ ان پر غالب آجاتا ہے۔ وہ اس کے سامنے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اور واقعی عنداللہ یہ بالکل مبرّا ہیں کیونکہ انھوں نے کسی کو نقصان پہنچانا تو بجائے خود رہا کسی کی برائی کا اعتقاد نہیں رکھا۔ یہی ایک بے ضرر انسان کی شان ہوتی ہے مگر دنیاوی میدان میں ان کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور سوءِ ظن والے گو کسی انسان کے متعلق بد اعتقادی کے مرتکب تو ہوتے ہیں لیکن نقصان سے ہمیشہ محفوظ و مامون رہتے ہیں اور بد اعتقادی و سوءِ ظن پر جب تک عمل نہ کیا جائے وہ کوئی جرم نہیں۔ جرم صرف اس کے مطابق عمل کرنا ہے اور یہ لوگ عمل تو اس کے مطابق نہیں کرتے صرف اپنے تحفظ کی خاطر اُن سے بچتے ہیں۔

راہِ اعتدال کا قرآنی قانون

انبیاءؑ اور ان کے پیرو ہمیشہ راہِ اعتدال پر گامزن رہتے تھے اور اسی لئے ان کی تحریکیں کامیاب رہتی تھیں۔ سب سے زیادہ کامیاب و درخشاں تحریک صرف خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور آپ کے ساتھیوں کی تحریک تھی۔ اتنی کامیابی اس عالمِ کون و فساد میں کسی انسانی تحریک کو نصیب نہیں ہوئی جو کہ ان حضرات کی تحریک کو نصیب ہوئی۔ چند بے سروسامان افراد اٹھ کر قیصر و کسریٰ کے تاج کے مالک بن جاتے ہیں اور اُن کا جاہ و جلال اُن کے راستے کو نہیں روک سکتا بلکہ قیصر و کسریٰ کی جبروتی طاقت کو وہ خس و خاشاک کی طرح پیوند خاک کرتے ہوئے مشرق و مغرب پر قابض ہو جاتے ہیں۔ یہ کامیاب

تحریک جن لوگوں نے چلائی ان کی شان خود قرآن نے بیان فرمائی ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق اعلان ہوتا ہے کہ عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم۔ یہ دونوں صفتیں یعنی عزیز و حریص آپ کی شدت و سوء ظن کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ آگے ارشاد ہوتا ہے کہ بالمومنین رؤف الرحیم یہ رؤف و رحیم کی دونوں صفتیں آپ کی نرمی و حسنِ اعتمادی کی طرف غمازی کرتی ہیں۔ گویا آپ سوء ظن کی جگہ سوء ظن اور حسن ظن کی جگہ حسن ظن استعمال فرماتے تھے۔ اور اسی کا نام اعتدال ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے اور اسی میں جب افراط ہو جائے تو ضالین کی راہ ہے ——————

اگر تفریط ہو جائے تو مغضوب علیہم کی راہ ہے اور صحابہ کے متعلق فرمایا اشداء علی الکفار۔ یہ ان کی شدت کا بیان ہے جس سے سوء ظن اور بے اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور آگے فرمایا رحماء بینھم یہ ان کی نرمی کا بیان ہے جس سے خوش اعتمادی و حسنِ ظن پیدا ہوتا ہے۔ غرضیکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بھی اپنے پیغمبر کی طرح خوش اعتمادی و سوء ظن دونوں کے مالک تھے۔ اور ان دونوں کو اپنے محل میں استعمال فرماتے تھے اسی کا نام اعتدال ہے اور اسی لیے صحابہ کرام کی جماعت کو امت متوسطہ کے لقب سے ملقب فرمایا۔

کذالک جعلناکم امۃ وسطاً (الآیہ) غرضیکہ یہی اعتدال پسندی اور میانہ روی اُن کی کامیابی کا ذریعہ بنی۔ اور یہ وصف ان حضرات میں بہ حیثیت مجموعی تھا در نہ افراد کی کوتاہیاں تو ہوا ہی کرتی ہیں اور یہاں بھی تھیں یہی حسن ظن کا غلبہ تھا جس نے حضرت عثمان رضہ اور حضرت علی رضہ کو مصائب و آلام میں گرفتار

کئے رکھا تھا لیکن صحابہ کی جماعت بہ حیثیت جماعت میانہ اور امت وسطہ و جماعت معتدلہ صراطِ مستقیم پر گامزن تھی اور اسی وجہ سے کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئی۔ امت کی تحریکوں میں چونکہ یہ اعتدال پسندی اور میانہ روی نہ رہی اس لئے اکثر ناکام رہیں۔ اور پھر ناکامی کی وجہ سوءِ ظن کا غلبہ نہیں تھا کیونکہ سوءِ ظن کے غلبہ والے تو جماعت ہی نہیں بنا سکے۔ بلکہ ان لوگوں کے حسن ظن کا غلبہ تھا۔ جس کی وجہ سے جماعت تو بہت جلدی بن جاتی تھی لیکن اس میں کھوٹے کھرے کی تمیز نہ ہوتی تھی۔ ہر طرح کے لوگ شریک ہو جاتے، دوست بھی اور دشمن بھی۔ اور یہی دشمن جو دوستوں کے لباس میں ہوتے تھے آخر تحریک کو ناکام بنانے کا ذریعہ ہوتے تھے۔ ایسے ہی غداروں کو قرآن کریم نے منافقین کہا ہے۔ ان کے خصائصِ ذمیمہ کھول کر بیان کئے ہیں تاکہ امت ان سے بچے۔ واللہ اعلم!

راہِ اعتدال اور اس کی عملی تشکیل

اسی حسنِ اعتماد و حسنِ ظن سے فائدہ اٹھا کر دشمن کا سراغ رسانی کا محکمہ تحریکوں کے حالات و کوائف کی اطلاع دشمن کو فراہم کرتا ہے اور پھر وہ تحریک کو کامیابی سے پہلے ہی کچل دیتا ہے۔ اس سراغ رسانی میں ہمیشہ منافق قسم کے لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ خصوصاً مسلمانوں میں تو ہمیشہ اپنے ہم مذہب ہی دشمنوں کی سراغ رسانی کا کام کرتے رہے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کسی دوسرے مذہب کا آدمی بظاہر اسلام قبول کر کے مسلمان ہو گیا اور باطنی طور پر

اپنے مذہب پر رہا اور جاسوسی و سراغ رسانی کا کام انجام دیتا رہا۔ جیسا کہ کرم شاہ نامی پیر افغانستان میں امان اللہ خاں صاحب کا تختۂ حکومت الٹا کر واپس یورپ چلا گیا اور پھر معلوم ہوا کہ وہ انگریز تھا۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے ورنہ اکثر و بیشتر اس بدقسمت قوم کے اپنے ہی افراد نے دشمن کے لئے جاسوسی و سراغ رسانی کا کام انجام دیا ہے۔ چنانچہ اسی جاسوسی سے بچنے کے لیے ہمیشہ تحریکوں کے بانی تحریک کے اراکین کے دو حصے بناتے ہیں۔ ایک مخصوص حصہ جس کا کام سوچ بچار کرنا اور تحریک کے لئے اسکیمیں اور منصوبے بنانا ہوتا ہے اس حصے میں بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے اور اپنے مخصوص اعتمادی آدمیوں کو لیا جاتا ہے۔ یہ لوگ باہم گہر راز داں ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے پر باہم اعتماد کرتے ہیں۔ اور پوری رازداری سے کام لیتے ہیں۔ اور دوسرے کسی کو اپنے راز سے آگاہ نہیں کرتے۔ یہ حصہ معدودے چند اور مخصوص افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔

دوسرا حصہ عام کارکنوں کا جن کا کام اسکیموں پر عمل کرنا ہوتا ہے اور ان لوگوں کو کوئی راز کی بات نہیں بتائی جاتی۔ اور اس حصے میں فراخ دلی سے کام لیا جاتا ہے۔ اور عام لوگوں کو شریک کار بنایا جاتا ہے۔ جس طرح پہلے حصے کے اراکین کے انتخاب میں انتہائی سوء ظن سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح اس حصے کے انتخاب میں انتہائی حسن ظن سے کام لینا پڑتا ہے۔ گویا پہلے حصے کے انتخاب میں تنگ ظرفی و تفریط برتی جاتی ہے اور دوسرے حصے میں وسیع الظرفی سے کام لیا جاتا ہے ان دونوں حصوں کے مختلف قسم کے نام ہیں مگر قریباً قریباً مطلب سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔

مطلب میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے تحریک اشاعت اسلام (جس کا نام اس نے اپنی اصطلاح میں جہاد رکھا ہے) کے اصول وضوابط بیان کئے ہیں۔ اسی ضمن میں ایک قانون یہ بیان فرمایا ہے کہ کوئی خبر امن یا خوف کی آئے تو مجاہدین کو چاہیئے کہ اس خبر کی تشہیر سے پہلے اس کو اپنے امیر اور ان لوگوں تک پہنچائیں جو اصحاب استنباط ہیں۔ تاکہ وہ اس خبر کی تہ تک پہنچ کر کوئی فیصلہ کریں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ قرآن مجاہدین کے دو حصے قرار دیتا ہے ایک مجاہدین کا اور دوسرا مستنبطین کا۔ مجاہدین و مستنبطین یہ دونوں اصحاب اپنا اپنا کام انجام دیں۔ مجاہدین کا کام صرف جسمانی ہے یعنی عملی جہاد کو انجام دینا۔ اور مستنبطین کا کام دماغی ہے یعنی مجاہدین کے لئے منصوبے بنانا اور طریق کار متعین کرنا جیسا کہ خود لفظ استنباط سے اس کا نام ماخوذ ہوتا اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ استنباط لغت میں زمین سے پانی نکالنے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی ہیں کسی بات کی تہ تک پہنچنے کے۔ غرضیکہ قرآن کریم بھی اس قانون تقسیم کار کی ہدایت کرتا ہے کہ جماعت کا ایک حصہ مجاہدین وعاملین کا ہو اور دوسرا مستنبطین ومفکرین کا۔

جذبۂ قومیت کا اصول

قوموں کے عروج وزوال کے اصولوں کے تحت یہ قانون بھی ماہرین فلسفۂ تاریخ نے بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ اس فن کے بانی علامہ ابن خلدون

نے اس کو وضاحت سے لکھا ہے۔ کہ ہر قوم کی قومی حیات افراد کی طرح تین حصوں پر منقسم ہوتی ہے۔ ایک زمانۂ نشوونما جس کو دورِ ارتقا کہتے ہیں دوسرا زمانہ استوا جس میں نہ ترقی ہوتی ہے اور نہ تنزل، تیسرا زمانہ تنزل جس میں جسم کے اعضا وقویٰ ہر چیز میں تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ تا آنکہ اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اس کو دورِ انحطاط کہتے ہیں۔ یہ تینوں دور انسان کی طرح قوموں اور جماعتوں کی زندگی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ پہلے قوم کسی تحریک کی وجہ سے عالمِ وجود میں آتی ہے اور پھر دورِ ارتقا میں اس کی ہر چیز ترقی پذیر ہوتی ہے اور دورِ استوا میں گو ترقی تو نہیں ہوتی مگر تنزل بھی نہیں ہوتا اور جو کچھ پہلوں نے حاصل کیا ہوا ہوتا ہے اس کی وہ پوری طرح حفاظت کرتی ہے۔ اور تنزل و زوال سے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن جب دورِ انحطاط شروع ہوتا ہے تو پھر قوم کی ہر چیز میں تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ اور پہلوں نے جو کچھ قومی اقتدار حاصل کیا ہوا ہوتا ہے وہ اس کو بھی سنبھالنے کے اہل نہیں ہوتی۔ وہ بھی اس کے قبضے سے دن بدن نکلتا جاتا ہے۔ آج ایک چیز گئی کل دوسری پھر تیسری حتیٰ کہ قوم صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جاتی ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے جیسا کہ جسمانی انحطاط اندرونی قویٰ کے ضعف کی وجہ سے ہوتا ہے ایسے ہی قوموں کا ظاہری انحطاط ان کی باطنی و اخلاقی قوتوں کے ضعف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے قوم کا اخلاقی انحطاط شروع ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ہر ایک خوبی رخصت ہوتی جاتی

قوموں کی خودداری و عزتِ نفس۔ قومی وفاداری و جذبۂ قومیت، حریت پسندی و آزادئ طبع قناعت و صبر و استقلال، شجاعت و جرأت، سخاوت اور جود و ایثار وغیرہ وغیرہ غرضیکہ ان سب اخلاق کا خاتمہ ہو جاتا ہے جن کی بدولت قومی اقتدار و ارتقاء حاصل ہوا تھا۔ اس قانون کے تحت ہم امتِ مسلمہ کو پرکھتے ہیں سو اس کا بھی دورِ ارتقاء بڑا مختصر دور تھا۔ صحابہ کے ساتھ وہ بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد دورِ استقرار شروع ہوا۔ اور بہت ہی طویل مدت رہا حتی کہ یزید سے شروع ہو کر عثمانی ترکی خلیفہ کے عہد تک رہا۔ گو اس میں بھی تاتاری حملے تک نوجوانی و شباب کا دور تھا۔ اس کے بعد دورِ شباب تو نہ رہا لیکن پھر بھی ضعف و اضمحلال سے ہم بچے رہے۔ لیکن جب سے مغربی قوموں نے عروج حاصل کرنا شروع کیا ہے تو ہم بہ حیثیت مسلمان قوم کے بڑھاپے کی زندگی بسر کر رہے ہیں اب جب سے ہم سے ظاہری اقتدار چھین چکا ہے ویسے ہی باطنی اخلاقِ حمیدہ کی دولت سے بھی ہم محروم ہو چکے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔ اب ہم میں نہ حریت پسندی رہی نہ قومیت پسندی، نہ ایثار و قربانی۔ یہ سب اخلاق اب دوسری قوموں کے حصے میں ہیں۔ اگر قوم میں قومیت ہو تو کوئی فرد قوم کا کبھی بھی غیر کا جاسوس اور آلۂ کار نہیں بن سکتا۔ لیکن افسوس کہ ہم میں قومیت نہ رہی۔ ان دو قانون کو ذہن میں کرلیں یعنی اعتماد باہمی میں اعتدال اور جذبۂ قومیت۔ اگر یہ دونوں صفات کسی تحریک کے کارکنوں میں ہوں تو ناکامی کبھی بھی ان کے حصے میں نہیں

آسکتی۔ ناکامی جب بھی ہوگی ان میں سے ایک کی کمی سے ہوگی۔
واللہ اعلم!

اسبابِ ناکامی پر طائرانہ نگاہ

حضرت شیخ الہند بانی تحریک حسن اعتماد میں بہت بڑھے ہوئے تھے اور بعض ایسے افراد کو اپنا مشیر کار بنایا ہوا تھا جو کہ اندرونی طور پر انگریز کے جاسوس تھے اور ظاہری طور پر حضرت شیخ رح کے معتقد اور فدائی بنے ہوئے تھے۔ یہ لوگ پوری کارروائیوں سے انگریز کو مطلع کر رہے تھے۔ چونکہ مسلمان قوم میں قومی وفاداری کا جذبہ قومیت ختم ہو چکا تھا اس لئے انگریز کو ایسے افراد مسلمان قوم میں کافی مل گئے۔ اس کے برعکس ہندو قوم کے کسی ایک فرد کے متعلق بھی آج تک اس تحریک میں جاسوسی کرنے کا شبہ تک نہیں کیا گیا۔ لیکن مسلمانوں میں سے بہت لوگ حضرت شیخ رح کی تحریک میں بطور جاسوس شریک تھے۔ حضرت شیخ کو ایسے لوگوں کے متعلق بارہا کہا بھی گیا۔ لیکن حضرت نے کہا یہ بدگمانی ہے یہ صاحب ایسے نہیں ہو سکتے۔ افسوس اگر حضرت شیخ الہند کا دماغ ہوتا اور تنقیدی وصف حضرت سندھی کا ہوتا تو یہ خوش اعتمادی و حسن ظنی اتنا نقصان نہ پہنچاتی۔ حضرت سندھی کسی کا لحاظ نہیں فرماتے تھے اور نہ ہی حسن ظن رکھتے تھے۔ لیکن حضرت شیخ کے سامنے یہ اس طرح کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ غرضیکہ حضرت شیخ کی حسن اعتمادی اور قوم کی قومیت

فقدانی ان دونوں نے مل کر تحریک کو ناکام بنایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ کی خصوصی مجلسوں کی رپورٹ بھی انگریز کو باقاعدہ مل رہی تھی حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں کہ جب مصر میں عدالتی کارروائی ہوئی تو وہاں انگریز افسر نے ایسے ایسے واقعات بتائے کہ جن کا علم خصوصی آدمیوں کے بغیر کسی کو بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر ان لوگوں میں بعض تو باقاعدہ انگریز کے ملازم تھے۔ اور تنخواہ لے کر کام کر رہے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جو کہ خلوص سے تحریک میں شریک ہوئے تھے مگر گرفتاری کے بعد یا ویسے ہی انگریز کے ظلم و تشدد سے ڈر کر حالات بتلا دیتے۔ یہ درجہ بھی ہے تو جرم کیونکہ جذبہ ایثار کی کمی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ کمی ایثار بجائے خود ایک جرم ہے مگر پہلی قسم سے یہ کم درجے کا جرم ہے۔ پہلی قسم تو سراسر غداری و منافقت ہے جس کے کفر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور یہ بدترین مجرم ایسے ہی لوگ ہیں۔ درحقیقت ایسے ہی غداروں کی سزا انہیں گولی سے اڑا دینا ہے۔ اب ہم یہاں دونوں قسم کی جاسوسی پر علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے، کیونکہ یہی جاسوسی تحریک کی ناکامی کا سبب بنی۔ دنیا میں جس تحریک کے ہاتھوں میں ایک بھی غدار آجائے تو وہ لازماً ناکام ہو جاتی ہے۔ لیڈروں کا کام تو اعتماد کرنا ہے مگر قوم کا کام وفاداری ہے۔ آج اگر جمال عبدالناصر صدر جمہوریہ متحدہ عربیہ کو رازدار و وفادار ساتھی نہ ملے ہوتے تو وہ یقیناً ناکام ہو جاتا۔ یہ کمال ناصر سے زیادہ قوم کا ہے لیکن افسوس

کہ حضرت شیخ الہندؒ کو ایسی قوم نہ ملی۔ پھر لطف یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند کے رفقاء سے کار زیادہ تر علماء تھے۔ اور آج سب سے زیادہ غیروں کے ہاتھ میں بکنے والی قوم یہی ہے۔ اعاذنا اللہ منہ!

اسبابِ ناکامی کی تفصیل

حضرت شیخ خود فرمایا کرتے تھے کہ۔ من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم۔ کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد۔ ایسے افراد کا نام بتانا تو آج مشکل ہے اور اگر نام بتائے بھی جائیں تو لوگ اعتبار بھی نہ کریں گے۔ اس لئے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے بزرگی کی آڑ میں اپنے آپ کو بایزید و جنید بنایا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ حضرت مدنی جیسا آدمی بھی اُن کے نام لینے کی جرأت نہیں کر سکا تو میں اگر کچھ لکھوں تو دنیا کب مانے گی۔ لیکن میں اگر نہ بھی ظاہر کروں تو تاریخ خود اُن کا پردہ چاک کر دے گی۔ اور ان کو عالم آشکارا کر کے دُنیا کو اُن کی غداریوں سے آگاہ کرے گی۔ بایں ہمہ حضرت سندھی سے جن حضرات کے نام سنے ہیں وہ پیش کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔ درحقیقت جو لوگ حضرت شیخ کے ساتھ تھے اور انگریز کی جاسوسی کے محکمہ کے تنخواہ دار تھے ان کی زندگیاں ہی اُن کے کرتوتوں کی شاہد ہیں۔ ایک سمجھدار آدمی جس کو سیاسیات سے کچھ واقفیت ہو وہ ان کی زندگیوں سے معلوم کر سکتا ہے کہ کون جاسوس تھا اور کون نہیں تھا۔

(۱) حضرت شیخ الہند کی خصوصی مجلس کے ایک رکن تھے ان کی بابت بارہا لوگوں نے حضرت شیخ کو آگاہ بھی کیا لیکن حضرت کی خوش اعتقادی کا یہ عالم تھا کہ آخر زندگی

تک اُن کو ساتھ رکھا بلکہ اپنی ایک عزیزہ سے ان کا عقد بھی کرا دیا۔ اور حضرت مدنی نے بھی اُن کی صفائی بیان کی ہے لیکن ان کی زندگی اور حالات بتاتے ہیں کہ وہ یقیناً جاسوس تھے۔ ان کا وطن پشاور رہے۔ یہ کاکا صاحب کی درگاہ کے متولیوں کے خاندان سے ہیں۔ دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے تحریک میں پہلے دیوبند میں پھر مالٹا میں حضرت کے ساتھ رہے اور پھر آخر رہائی کے بعد بھی ساتھ ہی رہے۔ اُن کے متعلق مشہور ہے کہ یہ صاحب جاسوس تھے۔ اب تک وہ بقید حیات ہیں اور اپنے علاقہ میں مقیم ہیں۔ اُن کے جاسوس ہونے کے کئی ثبوت ہیں:۔

(۱) مصر کی عدالتی کارروائی سے پتہ چلتا ہے کہ دیوبند و دہلی کے ان خصوصی مجلسوں کے حالات انگریز کو معلوم ہیں جن میں یہی حضرات ہوتے تھے۔ مولانا محمد علی مولانا شوکت علی، مولانا آزاد، گاندھی جی، موتی لال، مہندر پرتاپ، برکت اللہ ہردیال، مولانا سندھی، مولانا ہادی حسن، مولانا محمد میاں صاحب انصاری اور مولانا عزیز گل صاحب۔ اب ان باقی حضرات میں سے کسی پر بھی شک و شبہ نہیں ہو سکتا بجز اُن کے، کیونکہ باقی حضرات نے اپنی زندگیاں انگریز کی مخالفت میں خرچ کر دیں۔ اور مصائب و آلام برداشت کئے تو لامحالہ یہ خبریں پہنچانے والے یہی صاحب تھے۔

(۲) حضرت شیخ جب مالٹا سے واپس بمبئی پہنچتے ہیں تو جہاز پر ہی آپ کو ایک سی آئی ڈی کا مولوی ملتا ہے اور وہ وہ باتیں بتاتا ہے جو مالٹا کے قید خانے میں ان تین حضرات میں ہوئیں یعنی شیخ الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور مولانا

ھ مولانا حکیم ذریعت حسین رح ۱۰۳

ھ

عزیز گل صاحب۔ کیونکہ مولانا وحید الزماں صاحب جو کہ قیدی پہلے ہی انتقال فرما چکے تھے۔ غور کریں ان تین حضرات کی باتیں انگریز تک پہنچانے والا ان تین میں سے کوئی ایک ضرور ہے۔ اور وہ کون ہے؟ کیا حضرت مدنی ہو سکتے ہیں حاشا وکلّا یہ تو وہم بھی نہیں گزر سکتا۔ نتیجہ آپ خود ہی نکالیں۔

(۳) ان مولوی صاحب کی معاشرتی زندگی ایک بلند پایہ دولت مند کی سی رہی ہے اور اب بھی ہے۔ کافی سے زیادہ زمین خریدی ہے اور بہترین قسم کا مکان بنایا ہے۔ خورد و نوش اور دوسرے لوازمات زندگی امیرانہ ہیں۔ اور بظاہر آمدنی کبھی بھی اتنی بلند نہیں رہی جس سے اس طرح کی زندگی بسر کی جاسکے۔ بنابریں ضرور کوئی باطنی صیغۂ آمدنی ہے جس سے یہ تمدّن پورا ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔

(۴) امیر احمد خاں نامی ایک صاحب تھے جو کہ اٹک کے رہنے والے تھے دیوبند میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ انگریز نے ان کو خرید لیا۔ تین سال ہندوستان میں جاسوسی کا کام کیا۔ پھر انگلینڈ میں سراغ رسانی کا امتحان دیا۔ اور دوسرے ممالک میں انگریز کی جاسوسی کا کام کرتے رہے۔ جرمنی، روس، جاپان میں کام کیا آخر ترکی میں متعین ہوئے تو خیالات میں جنبش آئی۔ انگریز سے باغی ہو کر مستعفی ہو گئے۔ انگریز نے ہندوستان میں داخلہ بند کر دیا۔ آپ جاپان چلے گئے وہاں ایک اخبار نکالا۔ اسی دوران بابو سبھاش چندر بوس وہاں گئے۔ اُن سے شناسائی ہو گئی۔ انھوں نے واپس آکر کوشش کی تو ان کو ملک آنے کی اجازت مل گئی۔ کچھ عرصہ سوشلسٹ پارٹی میں کام کیا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ان کو اپنے

گاؤں میں پولیس کی نگرانی میں پابند کر دیا۔ پھر گرفتار کر کے لاہور چھاؤنی لائے اور یہاں سے لاپتہ کر دیا۔ کچھ عرصے بعد وارثوں کے شور مچانے پر اعلان کر دیا کہ وہ پولیس کی نگرانی میں جہلم کے قریب چلتی گاڑی سے کود کر فرار ہو گیا۔ خدا معلوم کیا ہوا۔ ان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے بتلایا کہ جب میں ہندوستان میں جاسوسی کا کام کرتا تھا تو اس زمانہ میں دیوبند سے وابستہ بہت سے مولوی یہ کام کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بتلایا کہ میں خود ایک مولوی صاحب کے ذریعے اس کام میں تھا۔ اس کا نام بھی انھوں نے بتایا تھا۔ وہ عیدگاہ دیوبند کے خطیب تھے۔ یہ بھی بتلایا کہ ایک اور مولوی صاحب جو پشتو بولتے تھے اور میرے ساتھ پشتو میں بات کرتے تھے پہلے تو مجھے ان کا علم نہ تھا، لیکن جب میں اس کام پر مقرر ہوا تو علم ہوا کہ وہ بھی یہی کام کرتے ہیں۔ اور ان کے ذمے اہم کام ہوتے ہیں، ان کا نام بھی انھوں نے بتلایا، یہ صاحب کاکاخیلی تھے۔ جب میں انگلینڈ گیا تو ان کے دو خط بھی میرے نام گئے، غالباً کسی ذاتی کام کے لئے انھوں نے لکھے تھے۔ اس بیان کو غور سے پڑھیے اور خود ہی فیصلہ کیجئے۔ ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔

(۵) حضرت شیخ الہندؒ انگریز کی شکل دیکھنا بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مصر میں جب انگریز فوجی افسر کے ساتھ بات چیت ہوئی اور اس کے سامنے بیان دینا پڑا تو آپ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور بیان دیتے رہے۔ انگریز افسر نے دوسرے دن حضرت مدنیؒ سے اس کی شکایت بھی کی۔ ایک طرف سے جب یہ معاملہ تھا تو دوسری جانب سے انگریز بھی ایسے لوگوں کو دیکھنا بھی

نہیں چاہتے تھے۔ حضرت شیخ کا تو یہ حال تھا لیکن حضرت شیخ کے یہی فدائی و شیدائی فنافی الشیخ صاحب ایک میم سے شادی رچاتے ہیں اور وہ آج تک عیش اڑا رہے ہیں۔ یہاں مولوی صاحب کی صفائی پیش کرنے والوں کو چند باتوں پر غور کرنا چاہیئے۔ کیا حضرت شیخ الہند کے مسلک کا فدائی انگریز سے رشتہ کر سکتا ہے؟ کیا انگریز اپنے مخالفوں کو رشتہ دے سکتا ہے۔ اور کیا ایک مولوی کی مولویانہ آمدنی سے ایک میم صاحبہ کا تمدن پورا ہو سکتا ہے۔ ایک متوسط درجے کا متمول آدمی بھی میم کے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔ بہرحال ایک تو یہ مولوی پشاوری مرکزی مجلسوں میں شریک رہ کر سب حالات سے انگریز کو اطلاعات پہنچاتے رہے اور اسی غرض سے حج کو ان کے ساتھ گئے اور پھر مالٹا میں بھی ساتھ ہی رہے۔ ایسے حال میں انگریز سے کوئی بات پوشیدہ کیسے رہ سکتی تھی۔

دوسرے دیوبندی مولوی صاحب خطیب عیدگاہ دیوبند ہیں۔ یہ مولوی صاحب گو مرکزی مجلس منتظمہ کے رکن تو نہ تھے لیکن تحریک کے کئی شعبوں سے وابستہ تھے خصوصاً مالیاتی شعبے سے اس لئے یہ کافی کام کر سکتے تھے۔ امیر احمد خاں صاحب کا بیان ہے کہ میں ویسے تو اپنی رپورٹ دہلی میں پہنچاتا تھا مگر گرما میں شملہ جانا پڑتا تھا تو میں راستے میں انبالہ میں مولوی صاحب کے پاس ٹھہرا کرتا تھا کیونکہ مولوی صاحب مذکور انبالہ میں چھاؤنی کی جامع مسجد کے خطیب تھے بعض دفعہ مولوی صاحب بھی میرے ساتھ جاتے تھے اور شملہ جا کر علیحدہ ہو جاتے تھے کیونکہ ہمیں ایک دوسرے کو بھی اپنی باتیں بتلانا اور پہچان کرانا منع تھا۔ وہ اپنی رپورٹ

علیحدہ پیش کرتے تھے اور میں علیحدہ ۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ کیا رپورٹ پیش کیا کرتے تھے ۔ واللہ اعلم!

تیسرے چکوالی مولوی صاحب یہ چکوال ضلع جہلم کے رہنے والے تھے اور لاہور میں محاذ تحریک کے قائد تھے حضرت سندھی رح کا بیان ہے کہ جاسوسی کے طور پر تحریک میں شریک تھے حقیقت بھی یہی نظر آتی ہے ۔ اس لئے کہ ان کو حکومت لوگوں کے دکھانے کو گرفتار کرتی ہے اور پھر جلد ہی رہا کر دیئے جاتے ہیں اگر یہ جاسوس نہ ہوتے تو تحریک کے ذمہ دار رکن تھے نہ معلوم کتنے سال جیل میں رہتے ۔ اسی طرح دیوبندی مولوی صاحب کو سرے سے گرفتار ہی نہیں کیا گیا ۔ مزید برآں یہ کہ مولانا احمد اللہ صاحب پانی پتی ایک سادہ لوح بزرگ تھے اُن کو حکومت گرفتار کرتی ہے ۔ وہ تحریک کے متعلق کوئی بات بھی نہیں بتلاتے مگر ایک دن یہی چکوالی مولوی صاحب جیل میں تنہائی میں اُن کے پاس بیٹھتے ہیں اور دیوار کے پیچھے سی آئی ڈی و فوجی افسروں کو بٹھلاتے ہیں اور ان سے فرداً فرداً ایک ایک بات کا اقرار کراتے ہیں کہ دیکھئے ہم نے وہ معاملہ اس طرح کیا تھا اور فلاں اسکیم اس طرح بنائی تھی ۔ جب مولوی احمد اللہ صاحب سب باتوں کا اقرار کر چکتے ہیں تو افسر سامنے آجاتے ہیں ۔ درمیان میں صرف ایک پردہ تھا ۔ افسروں نے وہ پردہ اٹھا کر مولوی احمد اللہ صاحب سے کہا ۔ آپ تو ان باتوں کے منکر تھے اور لاعلمی ظاہر کرتے تھے ، اب غریب مولوی صاحب پھنس چکے تھے معافی مانگ کر ہمیشہ کے لئے سیاسیات سے علیحدہ ہو گئے ۔ اور آخر تک علیحدہ رہے ۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے ۔ اس واقعے سے آپ اندازہ کر لیں کہ کیا مجبور آدمی اس طرح

دوسروں کو گرفتار بلاکر اسکتا ہے۔ یہ تو ہو سکتا تھا کہ مولوی صاحب خود مجبوری کی وجہ سے اپنے جرم کا اقرار کرتے اور معافی مانگتے۔ مگر ایک دوسرے آدمی سے اس طرح اقرار کرانا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مولوی صاحب ان واقعات کی رپورٹ پیش کرنے کے بعد اس کی تصدیق اس طرح ایک دوسرے رکن تحریک سے کرانا چاہتے تھے کہ میں نے جو رپورٹ حکومت کو دی ہے وہ ٹھیک ہے اور اس کے ثبوت میں یہ ساری کارروائی عمل میں لائی گئی۔ ورنہ ایک مجرم کو تو اپنے معاملات سے تعلق ہوتا ہے نہ کہ دوسرے لوگوں کے جرائم کی شہادتیں بھی۔ بہرحال چکوالی مولوی صاحب کی صاحبزادی حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے عقد میں تھیں۔ گویا آپ مولانا احمد علی صاحب کے خسر تھے۔ واللہ اعلم!

(۴) انہی لوگوں میں سے ایک قندھاری مولوی صاحب بھی تھے۔ آپ دیوبند سے فارغ التحصیل تھے۔ آپ حضرت شیخ الہند کی تحریک کے رکن بن کر قبائل میں جاکر تبلیغ جہاد کا کام کرتے رہے لیکن تعجب ہے کہ جب ریشمی خط پکڑا جاتا ہے اور راز فاش ہوتا ہے تو انگریز دباؤ ڈال کر حبیب اللہ خاں سے کابل کے سب انقلابیوں کو گرفتار کرواتا ہے تو قندھاری مولوی صاحب نہ صرف یہ کہ گرفتار ہی نہیں کئے جاتے بلکہ ان کو مستوفی الممالک کے ساتھ مشیر امور خارجہ مقرر کیا جاتا ہے۔ حبیب اللہ خاں اس وقت انگریز کی مرضی و منشا کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ پھر ان مولوی صاحب کو تو ایک ایسا عہدہ دیا گیا جو کہ انگریز اور افغان حکومت کے درمیان رابطہ کا درجہ رکھتا تھا، چنانچہ ان سے یہی کام لیا جاتا تھا کہ افغان حکومت نے کوئی بات انگریز سے منوانی ہوتی تو ان مولوی صاحب کی وساطت کے بغیر منظور نہ ہوتی تھی۔ انگریز صرف

ان کے واسطے سے ہی اس طرح کے مطالبات منظور کیا کرتا تھا۔ جیسا کہ یہ سب باتیں حضرت سندھی نے اپنی ذاتی ڈائری میں لکھی ہیں۔

(۵) مولانا چاند پوری صاحب کا نام بھی لوگ لیتے ہیں حضرت سندھی کی رائے بھی یہی ہے کہ مولوی صاحب نے پہلے تو وہاں حجاز میں کچھ ایسی حرکتیں کیں کہ جن سے مقصد یہ تھا کہ ترکی حکومت حضرت شیخ سے بدظن ہو کر ان کو گرفتار کرلے چنانچہ جدہ سے کچھ ایسے مشکوک خطوط حضرت شیخ کی خدمت میں لکھ کر بھیجے کہ اگر غالب پاشا مداخلت نہ کرتا تو شاید مدینہ کی حکومت آپ کو گرفتار کر لیتی۔ وہاں تو یہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوئے، یہاں کا معاملہ سارا پہلے بھی انگریز کو پہنچاتے رہتے تھے اور اب بھی پوری رپورٹ حجاز کی تحریک کی پیش کی۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ ہی مولوی محمد میاں صاحب جب خط لکڑی کی چھڑی میں لے کر آتے ہیں تو بمبئی گورنمنٹ کو کوئی خبر نہ تھی۔ لیکن ان مولوی صاحب کے پہنچتے ہی دیوبند اور ناتونہ میں ان لوگوں کے گھروں پر چھاپے پڑتے ہیں جن کا علم حضرت شیخ کے سوا صرف ان دونوں کو تھا۔ اس کا اور کسی کو پتہ ہی نہ تھا۔ یہ حضرت سندھی کا بیان ہے ہم اپنی جانب سے اتنی بڑی شخصیت کے متعلق فیصلہ کرنے کی جرأت ہی نہیں کرسکتے۔ اور نہ اس کے اہل ہیں۔ واللہ اعلم!

دوسری قسم ان کمزور لوگوں کی ہے جو انگریز کے ڈر سے حالات بتاتے رہے ان میں حبیب اللہ خاں امیر افغانستان اوّل نمبر پر آتے ہیں، کیونکہ اتنے بڑے آدمی سے یہ توقع نہ تھی، لیکن وہ انگریز کے ڈر سے سب کچھ انگریز کو بتا دیتے تھے دوسرے عنایت اللہ خاں ابن حبیب اللہ خاں ہے جس کو انگریز نے ولی عہدی کا

لالچ دے کر اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ درحقیقت ولی عہد افغان حکومت کی جانب سے سردار نصر اللہ خاں تھا لیکن وہ انقلابیوں سے مل گیا تھا اس لئے انگریز نے مدینہ منورہ سے ایک صاحب کو پیر بنا کر افغانستان بھیجا، اس نے وہاں جا کر خوب پیری مریدی چمکائی اور سردار عنایت اللہ خاں کو اپنا مرید بنا لیا اور اس کو یہ خواب سنایا کہ مجھے خواب میں نبی کریم صلعم کی زیارت ہوئی ہے اور انھوں نے فرمایا ہے کہ انگریز سے جنگ میں مسلمانوں کا نقصان ہوگا لہٰذا انگریز سے جنگ نہ کرنی چاہیئے اور حبیب اللہ خاں کے بعد اس کا بیٹا عنایت اللہ امیر ہوگا۔ لوگ خواہ مخواہ نصر اللہ خاں کا نام لیتے ہیں۔ یہ خواب سنا کر عنایت اللہ خاں کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ اور اس طرح اس کو انقلابیوں سے الگ کیا۔ اور ولی عہدی کا لالچ دلایا۔ اس کے بعد عنایت اللہ خاں انگریز کا دوست بن گیا اور افغانستان میں جو جو منصوبے تیار ہوتے ان کی اطلاع انگریز کو کرتا رہتا تھا۔ اس کا یہ پیر وہاں ملا چہار باغ کے نام سے مشہور ہے۔ اس لئے حبیب اللہ خاں نے جب انگریز کے اشارے پر انقلابیوں کو گرفتار کیا تو امان اللہ خاں نے جو کہ ان کے انقلابیوں سے ملا ہوا تھا اپنے والد حبیب اللہ خاں کو قتل کرا کے خود تخت حکومت پر قابض ہو گیا اور انقلابی لیڈروں کو رہا کر کے اپنا مقرب بنا لیا۔ اور انگریز پر حملہ کر کے افغانستان کو آزاد کرایا۔ واللہ علم!

(۳) اسی طرح جو نوجوان کالجی افغانستان ہجرت کر گئے تھے ان میں سے چند گرفتار ہوئے اور ہندوستان لائے گئے۔ ان میں میاں عبدالباری صاحب بھی ہیں جو آجکل پاکستان میں ایم ایل اے ہیں اُن سے حکومت نے معافی کا وعدہ کر کے سب کچھ معلوم کر لیا خصوصاً ان کے رشتہ دار سر محمد شفیع تھے، ان کے دباؤ اور دم

دلاسے میں آکر یہ غریب ناتجربہ کار سب کچھ بتلا کر رہا ہو گئے۔

(۴) مولوی محمد علی صاحب قصوری بڑے سرگرم رکن تھے لیکن گرفتاری کے بعد کمزوری دکھائی اور سب راز بتلا کر رہا ہو گئے۔

(۵) مولوی عبدالقادر صاحب قصوری نے بھی معافی مانگی اور راز کی باتیں بتلا کر جان چھڑائی۔ اور سیاسیات سے دست کش ہو گئے۔

(۶) مولوی احمد اللہ صاحب پانی پتی کا حال پہلے گزر چکا ہے کہ انھوں نے بھی معافی مانگی اور حالات بتلا کر جان چھڑا کر علیحدگی اختیار کی۔

(۷) قاضی مسعود صاحب حضرت شیخ الہند کے داماد تھے اور ناتجربہ کار نوجوان۔ ڈاکٹر انصاری صاحب نے ان کو حج کے موقع پر حج کے بہانے ایک ہزار روپیہ حضرت شیخ کے لئے دے کر بھیجا حضرت شیخ نے واپسی کے وقت ان کو اپنا عزیز سمجھ کر بعض اہم امور بتلا دیئے جن کے متعلق ان کو زبانی ہدایات دیں کہ ہندوستانی مراکز میں پہنچا دیں۔ یہ وہی حضرت کی خوش اعتمادی تھی جس نے یہ نہ سوچنے دیا کہ یہ باوجود مخلص ہونے کے ناتجربہ کار ہے اور مبادا حکومت ان کو گرفتار کر لے تو یہ ضبط کی تاب نہ لا کر راز فاش کر جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہندوستان پہنچتے ہی بمبئی سے ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور ان پر دو پولیس افسر مقرر ہوئے جو تجربہ کار اور شاطر زمانہ تھے۔ انھوں نے سب کچھ معلوم کر لیا اور ان کو دو ماہ بعد چھوڑ دیا گیا

(۸) حق نواز خاں صاحب پشاوری کوئی تحریک کے اعتمادی رکن تھے لیکن دل کے کمزور تھے۔ یہ ریشمی رومال والا خطوط ان کے ذریعے سے ہی سندھ میں حاجی عبدالرحیم کے پاس پہنچانا تھا حضرت سندھی کا خیال ہے کہ جب ان کے مکان پر

فوج کا چھاپہ پڑا تو ریشمی خط اُن کے قبضے میں تھا۔ انھوں نے ان کے حوالے کر دیا۔ لیکن یہ غلط ہے کیونکہ ریشمی رومال حاجی عبدالرحیم کے مکان سے انگریز کے ہاتھ آیا تھا۔ درحقیقت ان کے مکان پر جب فوج نے چھاپہ مارا تو خط وہاں سے نکل چکا تھا۔ انھوں نے اپنی کمزوری سے صرف راز بتایا ہوگا کہ بہاولپور دین پور میں خواجہ غلام محمد صاحب سجادہ نشین کے ہاں بھیجا جا چکا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن علی الصبح دین پور میں خواجہ صاحب کے مکان پر فوج نے چھاپہ مارا لیکن خط یہاں سے بھی نکل چکا تھا۔ خواجہ صاحب گرفتار کر لئے گئے۔ اور حق نواز خان صاحب کی نشان دہی پر دوسرے روز سندھ میں حاجی عبدالرحیم صاحب کے مکان پر چھاپہ مارا گیا۔ خط پکڑا گیا۔ اور حاجی صاحب ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئے

غرضیکہ اسی طرح کے کمزور قسم کے لوگ اور پہلی قسم کے غدار تحریک کی ناکامی کا ذریعہ بنے۔ ورنہ جو لوگ راسخ العقیدہ تھے انھوں نے تکلیفیں برداشت کیں لیکن تحریک کا راز کسی کو نہ بتلایا جیسے مولانا آزاد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی مولانا عبدالرحیم صاحب رائیپوری، مولانا ہادی حسن وغیرہ وغیرہ۔ ان لوگوں نے دوران جنگ میں قید و بند کی مصیبتیں برداشت کیں۔ تحریک کی ناکامی کے سلسلے میں بعض لوگوں کے نام غداروں میں آئے ہیں، اُن کے معتقدین سے ہم معذرت چاہتے ہیں اور اس معاملے میں خداوند تعالیٰ اسے بھی معافی کے خواستگار ہیں تاریخی نقطۂ نظر سے ہم مجبور تھے کہ اُن کا ذکر کریں ورنہ ہمیں کوئی ان سے عداوت تو نہیں کہ ضرور ان کو بدنام کرنے کا ذریعہ بنیں۔ حقائق کا جاننے والا اللہ تعالیٰ ہے بندہ اپنی تحقیقات علمیہ کا مکلف ہے۔ ہمیں علمی لحاظ سے جو کچھ حضرت مولانا عبید اللہ

سندھی رح جیسے بزرگوں کے واسطے سے معلوم ہوا عرض کر دیا ہے اور اگر فی الواقع یہ لوگ پاک دامن ہیں تو اللہ ہمیں معاف فرمائے کیونکہ بندہ عاجز و بے علم ہے۔ لاعلم لنا الاما علمتنا ہماری پکار ہے اور اگر یہ لوگ فی الواقع مجرم و غدار ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جرم کے مطابق سزا دے۔ آمین!

اس ساری بحث سے اصلی غرض یہ ہے کہ اس بات کی تحقیق کرنا کہ اتنی اہم تحریک کیوں ناکام ہوئی تاکہ آئندہ کسی تحریک کے چلانے والے عبرت حاصل کریں اور اُن خامیوں سے بچنے کی کوشش کریں جو اس تحریک کی ناکامی کا باعث ہوئیں۔ ہم نے اپنی بساطِ علم کے مطابق عرض کر دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ناکامی کا سبب دو باتیں تھیں۔ ایک تو قائدین میں خوش اعتمادی اور حسن ظن کا افراط جس کے سبب وہ دشمنوں کو بھی دوست سمجھ کر شریکِ راز بناتے رہے اور آخر ان کے ہاتھوں سے نقصان اٹھانا پڑا۔ اور وہی دوست نما دشمن ناکامیٔ تحریک کا باعث ہوئے۔ دوسری چیز جو ناکامی کا باعث ہوئی وہ تھی قوم میں جذبۂ قومیت کا فقدان۔ جس کے سبب قوم کے افراد اپنی قومیت کی قدر و قیمت نہ جانتے ہوئے اپنی قوم سے غداری پر آمادہ ہوئے اور غیروں کے آلۂ کار بن کر دنیا و آخرت میں ذلیل ہوئے۔ پہلی خامی محرکین کی اور دوسری متحرکین کی ہے، یعنی پہلی کمزوری تو قائدین و لیڈروں کی ہے اور دوسری پیروؤں کی۔ یا یوں کہہ سکتے کہ پہلا سبب ایجابی وصف ہے اور دوسرا سلبی خلق۔ اور یہی ایجاب و سلب مل کر ناکامی پر منتج ہوئے۔